سوغات
سہ ماہی

پورا پتہ
تیز ڈاک رسانی
آپ کے خط کا پتہ ہمارے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور جب آپ اپنی تحریر کے اس حصے میں اختصار سے کام لیتے ہیں تو ہمیں سخت چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ پتہ نامکمل ہو تو خط پہونچانے کے لئے بڑی تلاش سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں خط پہونچانے میں ضرورت سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔
پتہ مکمل اور صاف صاف لکھئے۔ آپ کے خط یقیناً جلدی پہونچیں گے۔
ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے
محکمہ ڈاک و تار
DA 40/261

میٹرک باٹ لازمی

یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء سے ذیل کے علاقوں میں سبھی لین دین میں میٹرک باٹوں کا استعمال لازمی ہوگیا ہے۔ تمام تجارتی باٹوں پر محکمہ ناپ و تول کے حکام کی مہر ہونا ضروری ہے۔ دوسرے بغیر مہر والے باٹوں کا استعمال غیر قانونی ہوگا

آندھرا پردیش: وشاکھاپٹنم، کرشنا، گنٹور، کرنول، حیدرآباد، ورنگل، اور نظام آباد کے اضلاع اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔ **آسام**: ضلع نوگاؤں اور گوہاٹی شہر۔ **بہار**: بھاگل پور، رانچی ڈویژن اور پٹنہ و ترہٹ ڈویژنوں کے میونسپل اور نوٹیفائڈ علاقے۔ **گجرات**: احمد آباد، راج کوٹ، بڑودہ کے شہر اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔ **کیرالہ**: کوذی کوڈ، ارناکولم اور کولم کے اضلاع۔ **مدھیہ پردیش**: سہور، اندور، گوالیار اور جبل پور کے اضلاع۔ **مدراس**: مدراس، چنگل پیٹ، جنوبی ارکاٹ، شمالی ارکاٹ کے اضلاع اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔ **مہاراشٹر**: بمبئی، پونا ناگپور، اورنگ آباد، شولاپور، اکولہ، امراوتی، وردھا، یوت مال کے شہر اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔ **میسور**: بنگلور، رائچور، دھارواڑ کے اضلاع اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔ **اڑیسہ**: برہم پور، کٹک اور سمبل پور کے شہر۔ **پنجاب**: امرت سر، جالندھر، لدھیانہ۔ انبالہ، پٹیالہ، اور گوڑگاؤں کے اضلاع اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔ **راجستھان**: اجمیر بیکانیر، جودھپور، جے پور، کوٹہ، اور اودے پور کے اضلاع۔ **اتر پردیش**: میرٹھ، آگرہ، لکھنؤ بریلی، مراد آباد، وارانسی، کانپور، جھانسی، الہ آباد اور گورکھپور کے شہر۔ **مغربی بنگال**: کلکتہ اور ہوڑہ کے میونسپل علاقے۔ **دہلی**: دہلی کا سارا علاقہ۔ **ہماچل پردیش**: منڈی اور سرمور کے اضلاع منی پور امپھال شہر۔ **تری پورہ**: اگرتلہ شہر۔ **جزائر انڈیمان و نکوبار**: پورٹ بلیر شہر۔ **پانڈی چری**: پانڈیچری کا سارا علاقہ

ذیل کی صنعتوں اور کاروباروں میں سبھی لین دین میں میٹرک باٹوں اور پیمانوں کا استعمال لازمی ہوگیا ہے
پٹ سن، سوتی کپڑے، لوہا، فولاد، انجینیری ساز و سامان، بھاری رسائن، سیمنٹ، نمک، کاغذ ریفریکٹریز، غیر آہنی آمیزہ دھاتوں اور ربڑ کی صنعتوں وناسپتی، صابن سازی اور تیل چیزیں تیار کرنے کی صنعت: کپاس کے وعدہ بازار کے کنٹرول میں اور کافی بورڈ کے لین دین میں میٹرک نظام

آسانی دیکھانی کے لئے

جاری کردہ: بھارت سرکار

شاہی اور خالص خوشبو!
میسور کا صندل کا تیل اپنی خوبیوں کی وجہ سے دنیا بھر میں ایک مسلمہ معیار
کے طور پر قبول کیا جاتا ہے!
اس کا خیال رکھئے کہ آپ صندل کا تیل ان کی اصلی ڈبیوں میں
خرید رہے ہیں، اور ان پر حکومتِ میسور کی مہر اور لیبل لگا ہوا ہے!!
حکومت میسور کا تیار کردہ
صندل کا تیل
خالص ہوتا ہے!
نقلی اور ملاوٹ کا تیل مت خریدئیے!
THE GOVERNMET SANDALWOOD OIL
FACTORY MYSORE

ماہی

سوغات

چھٹا شمارہ

مدیر

محمود ایاز

قیمت ۲ روپے

نومبر 1986

پتہ: ۲۷ کلاسن روڈ بنگلور ۵

مطبوعہ برقی پاسبان پریس بنگلور ۱

سوغات

چھٹا شمارہ

مقامِ اشاعت ـــــ ۲۷ کلائن روڈ بنگلور ۵

طباعت ـــــ برقی پاسبان پریس بنگلور ۱

قیمت ـــــ فی پرچہ عام (۲) روپے

(سالانہ آٹھ روپے)

پاکستان میں

سوغات کا سالانہ چندہ ۱۰ روپے (مع رجسٹری خرچ)
اس پتے پر روانہ کیا جا سکتا ہے

غلام حسین صاحب اسوسی ایٹڈ پرنٹرس

S.ITE.B.29

منگھوپیر روڈ۔ کراچی

نوٹ

خریداروں کو پرچہ بک پوسٹ کے ذریعہ روانہ کیا جاتا ہے۔ جو حضرات سالانہ چندے کے ساتھ رجسٹری کا بھی خرچ روانہ کریں گے ان کو پرچہ بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا جائے گا۔ بصورت دیگر ادارہ پرچہ کی عدم وصولی کی ذمہ داری نہیں لے سکتا

مضامین

افسانے

غزلیں

نظمیں

فرانز کافکا

فیصلہ

موسم بہار کے شباب میں اتوار کی ایک صبح کو جارج بنڈیمان ایک نوجوان تاجر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا کمرہ ندی کے کنارے پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے بوسیدہ مکانات میں سے ایک تھا۔ ان مکانات میں سوائے رنگ اور اونچائی کے اور کوئی چیز انھیں ایک دوسرے سے متاثر کرنے والی نہیں تھی۔ بنڈیمان نے ابھی ابھی اپنے ایک پرانے دوست کے نام جو سمندر پار جا کر بس گیا تھا، خط مکمل کیا اور دھیمے پن سے ایک خوابناک انداز میں خط لفافے میں ڈالنے کے بعد وہ لکھنے کی میز پر اپنی کہنیاں پھیلائے ہوئے دریچے کے باہر نظر جمائے پل اور دوسرے کنارے کی سرسبز پہاڑیوں کو تکے رہا تھا۔

اس وقت وہ اپنے اس دوست کے بارے میں سوچ رہا تھا جو چند سال پہلے اپنے وطن میں ایک روشن مستقبل کے امکانات نہ پاکر فی الواقع روس کو بھاگ گیا تھا۔ اب وہ سینٹ پیٹرس برگ میں ایک کاروبار چلا رہا تھا جو ابتدا میں تو بہت منافع بخش رہا لیکن اب بہت دنوں سے گھاٹے ہی میں چل رہا تھا جس کی شکایت وہ کبھی کبھار وطن آتا تو اپنے دوست سے کیا کرتا تھا، اس کا اپنے وطن کو آنا بھی تدریجاً بہت کم ہوتا چلا گیا تھا یعنی وہ ایک طرح سے ایک اجنبی ملک میں بغیر کسی فائدے کے اپنی جان کھپا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی نامانوس گھنی داڑھی اس کا وہ چہرہ پوری طرح چھپا نہیں سکی تھی جس سے جارج بچپن سے اچھی طرح آشنا تھا اس کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا تھا جس سے کسی چھپی ہوئی بیماری کا پتہ چلتا تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہاں اپنے ہم وطنوں کے حلقوں میں بھی اس کے کوئی تعلقات نہیں تھے اور روسی خاندانوں سے تو اس کے سماجی روابط بالکل ہی نہیں تھے۔ اس طرح سے اس نے گویا مستقل طور پر تجرد کی زندگی کو قبول کر لیا تھا۔

اک ایسے آدمی کو جو گھر سے ہٹ گیا ہو جس سے ہمدردی کی جا سکتی ہو، لیکن جس کی مدد کرنا ممکن نہ ہو بھلا کوئی کیا لکھ سکتا تھا؟

کیا اسے یہ مشورہ دیا جاتا کہ وہ اپنے وطن واپس لوٹ آئے اور یہاں از سر نو اپنی پرانی دوستیوں کی تجدید کرے جو وہ بہت آسانی کے ساتھ کر سکتا تھا۔ اور مختصر یہ کہ اپنے دوستوں کے تعاون پر بھروسہ کرے؛ لیکن

اس مشورے کے معنے یہ ہوئے کہ بہت ملائم الفاظ میں اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی اب تک کی ساری کوششیں بیکار تھیں وہ اب اپنی ہار مان لے اور لوگوں کی تمسخرانہ نظروں کا ہدف بنے اور یہ کہ وہ دراصل ایک بڑا بچہ ہے جو خود سے کوئی کام نہیں کر سکتا اور صرف اس کے دوستوں کو اچھے اور برے کا علم ہے لہٰذا اسے اپنے کامیاب زندگی گزارنے والے دوستوں کے مشوروں پر عمل کرنا چاہیئے؛ ان باتوں سے اسے جو تکلیف پہنچتی اس سے قطع نظر یہ بھی سوچنے کی بات تھی کہ کیا اتنی اذیت دینے کے بعد اصل مقصد پورا ہو جاتا؟ شاید اسے وطن لانا ممکن بھی نہیں تھا۔ وہ خود کہتا تھا کہ اپنے ملک کی تجارت سے وہ بالکل کٹ گیا تھا، اس صورت میں اسے یہاں واپس آنے کا مشورہ اس کے مزاج کی تلخی کو بڑھا دیتا اور وہ اپنے دوستوں سے اور زیادہ کشیدہ ہو کر پردیس میں اور بھی تنہائی اور اجنبیت محسوس کرنے لگتا لیکن اگر وہ اپنے دوستوں کی بات مان لے اور پھر کسی کند ذہنی کی وجہ سے نہیں بلکہ حالات کے دباؤ سے اپنے ملک میں بھی جم نہ پائے تو پھر؛ اپنے دوستوں کے ساتھ یا ان کے بغیر کام نہ چلا سکے یا ندامت اور خفت محسوس کرے، کسی ایک بھی ملک کو اور دوستوں کو اپنا نہ سکے تو پھر اس صورت میں اس کا اب جہاں ہے وہیں رہنا بہتر نہ ہوگا؟ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے کیسے یہ یقین کیا جا سکتا تھا وہ اپنے وطن میں آ کر ایک کامیاب زندگی گزارے گا؟ ان وجوہات کی وجہ سے یہ مشکل پیدا ہو گئی تھی کہ اگر کوئی آدمی اس سے خط و کتابت رکھے تو وہ یہاں کی ایسی معمولی سے معمولی بات بھی اسے کھلے طور پر نہیں لکھ سکتا تھا جو ایک دور سے جان پہچان کے آدمی کو بھی بتا دی جا سکتی تھی، اسے اپنے وطن کو آئے ہوئے تین سال گزر چکے تھے اور اتنی مدت سے نہ آنے کا لنگڑا بہانہ یہ تھا کہ روس میں سیاسی حالات بہت غیر یقینی تھے۔ گویا یہ غیر یقینی حالات ایک معمولی سے تاجر کو مختصر سی غیر حاضری کی اجازت نہیں دیتے تھے، جبکہ ہزاروں روسی اطمینان کے ساتھ بیرونی ملکوں میں گھومتے پھر رہے تھے۔ لیکن ان تین برسوں میں خود جارج کی حیثیت زندگی میں بہت بدل گئی تھی۔ دو سال پہلے اس کی ماں مر گئی تھی اور وہ اور اس کا باپ گھر میں ساتھ رہتے تھے۔ اس سانحے کی اطلاع جارج نے اپنے دوست کو یقیناً دی تھی اور اس نے اپنی ہمدردی کا اظہار خط میں اتنے خشک الفاظ میں کیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ایسے سانحے سے پیدا ہونے والے غم کا احساس شاید ایک اجنبی ملک میں ناممکن ہے، ماں کی موت کے بعد سے جارج کاروبار میں اور ہر ایک چیز میں پوری مستعدی اور عزم کے ساتھ حصہ لینے لگا۔

شاید ماں کی زندگی تک باپ کا ہر معاملہ میں اپنی بات منوانے پر اصرار اسے اپنے طور پر کوئی کام کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا اور شاید ماں کی موت کے بعد اس کے باپ کا جارحانہ رویہ کم ہو گیا تھا گو ویسے وہ اب بھی کاروبار میں عملی حصہ لیتا تھا۔ شاید اس کے رویہ میں تبدیلی، کاروبار میں خوش قسمتی سے یکے بعد دیگرے ہونے والی کامیابیوں

کی وجہ سے تھی۔ یہی وجہ زیادہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتی تھی، بہر حال جو کچھ بھی ہو ان دو برسوں میں کاروبار غیر متوقع ترقی کر گیا تھا، ملازموں کی تعداد دوگنی کرنی پڑی، مجموعی آمدنی پانچ گنا بڑھ گئی تھی اور بلاشک وشبہ ترقی کے مزید امکانات روشن نظر آرہے تھے۔

لیکن جارج کے دوست کو اس ترقی کا کوئی پتہ نہ تھا ابتدائی برسوں میں اور پھر شاید آخری بار جارج کی ماں کی موت پر تعزیتی خط میں اس نے روس آجانے کی ترغیب دی اور خاص کر جارج کی تجارت کی روس میں کامیابی کے امکانات کے امکانات کو تفصیل سے واضح کیا تھا لیکن اس نے متوقع آمدنی کا جو حساب بتایا تھا وہ جارج کی حالیہ آمدنی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، پھر بھی جارج اپنے دوست کو ان تجارتی کامیابیوں کے متعلق اطلاع دینے سے گریز کرتا رہا اور اتنے دنوں کے بعد اب اس کا ذکر کرنا یقیناً بہت نامناسب تھا

لہٰذا جارج اپنے دوست کو ایسی گپ شپ کی غیر اہم باتیں لکھنے پر اکتفا کرتا رہا جو ایک پرسکون اتوار کو کاہلی سے ادھر ادھر کی باتیں سوچتے ہوئے ذہن میں آتی ہیں، جارج کی خواہش یہی تھی کہ اس کے دوست نے اپنی طویل غیر موجودگی کے عرصہ میں اپنے شہر کے بارے میں جو خیالات اپنے اطمینان کی خاطر بنا رکھے تھے انھیں برہم نہ کیا جائے اور اس کوشش میں یوں ہوا کہ جارج نے تین الگ الگ کافی تفصیلی خطوط میں اپنے دوست کو ایک غیر اہم اور معمولی آدمی کی اتنی ہی غیر اہم اور معمولی لڑکی سے منگنی کی اطلاع دی یہاں تک کہ اس کے ارادوں کے برعکس اس کا دوست اس غیر معمولی واقعہ میں قابل ذکر دلچسپی لینے لگا۔

پھر بھی جارج ایسی ہی باتیں لکھنے کو ترجیح دیتا رہا اور یہ بات نہیں لکھی کہ ایک ماہ قبل وادسن فریڈا نامی ایک خوشحال خاندان کی لڑکی سے خود اس کی منگنی ہو گئی تھی۔ اس نے اکثر اپنی منگیتر سے اپنے دوست کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس خط وکتابت نے اپنے دوست سے اس کے تعلقات کو کس قدر عجیب وغریب بنا دیا تھا "تو پھر وہ ہماری شادی میں نہیں آئے گا" اس کی منگیتر کہتی "گو مجھے تمہارے تمام دوستوں کو جاننے کا حق ہے"۔ "میں اسے زحمت نہیں دینا چاہتا" جارج جواب دیتا "مجھے غلط مت سمجھو، ویسے شاید وہ آئے کم از کم میرا تو یہی خیال ہے لیکن یہاں آکر اسے خوشی نہیں ہو گی اور شاید وہ مجھ سے رشک محسوس کرے اور یقیناً اس کے دل میں بے اطمینانی کا احساس پیدا ہو گا اور چونکہ وہ اس بے اطمینانی کا کوئی علاج نہیں کر سکتا اس لئے اسے دوبارہ اکیلا واپس جانا ہو گا اکیلا تم جانتی ہو اس کے کیا معنے ہوتے ہیں؟" "وہ ٹھیک ہے لیکن کیا اسے کسی اور ذریعہ سے ہماری شادی کی اطلاع نہیں مل سکتی؟" "میں اس کا تدارک نہیں کر سکتا لیکن وہ جس قسم کی زندگی گزار رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس کا امکان بہت کم ہے"۔ "جب تمہارے دوست اس قسم کے تھے تو جارج تمہیں منگنی ہی نہیں کرنی چاہئے تھی"۔ "منگنی کے تصور میں

تم دونوں برابر کے شریک ہیں، لیکن بہرحال اب میں اپنے فیصلہ میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا" اور جب اس کے ہونٹوں کے درمیان جلد جلد سانس لیتے ہوئے اس نے کہا "کچھ بھی ہو میں بہت پریشان ہوں" تو جارج نے سوچا کہ اگر وہ اپنے دوست کو یہ اطلاع دے دے تو ایسی کونسی مصیبت آجائے گی"۔ میں اسی قسم کا آدمی ہوں اور ایسے ہی جیسا ہوں ویسا ہی قبول کرنا ہوگا" اس نے اپنے آپ سے کہا "اس کی خاطر میں اپنے آپ میں ایسی تبدیلیاں نہیں لا سکتا جو مجھے اس کے لئے ایک مناسب دموزوں دوست بنا سکیں"۔

اور اس نے سچ مچ اس اتوار کی صبح کو لکھے ہوئے طویل خط میں اپنے دوست کو منگنی کی اطلاع ان الفاظ میں دی "۔ میں نے تمھیں سنانے کے لئے سب سے اچھی خبر آخر تک محفوظ رکھی ہے فرائلن فریڈا نامی ایک خوشحال خاندان کی لڑکی سے میری منگنی ہو گئی ہے۔ فرائلن فریڈا کے لوگ تمھارے روس جانے کے بہت دنوں بعد اس شہر میں آکر بسے ہیں اس لئے شاید تم نہیں جانتے۔ تمھیں اس کے بارے میں مزید باتیں بتانے کا ابھی وقت نہیں ہے، لیکن آج کے لئے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں بہت خوش ہوں اور تمھارے میرے درمیان صرف اتنا فرق پڑے گا کہ آئندہ سے ایک بالکل عام قسم کے دوست کی بجائے تم مجھے ایک خوش و خرم دوست پاؤ گے۔ علاوہ ازیں میری منگیتر بھی جو تمھیں اپنی بہترین تمنائیں بھیجتی ہے، تمھیں صنف نازک سے ایک سچا دوست ملے گا جو ایک کنوارے نوجوان کے لئے کچھ اہم بات نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے تمھارے یہاں نہ آسکنے کی کئی وجوہات ہیں لیکن کیا میری شادی ایسا موقع نہیں ہے کہ تم اپنی تمام مشکلات کو خدا حافظ کہہ کر یہاں آجاؤ؟ لیکن پھر بھی تم سوچ کر اپنے مفاد کے پیش نظر جو ٹھیک اور مناسب معلوم ہو وہی کرو"

یہ خط ہاتھ میں پکڑے ہوئے جارج بہت دیر سے میز کے سامنے دریچہ کی طرف منہ کئے ہوئے بیٹھا تھا، وہ اتنا کھویا ہوا تھا کہ راستے سے گزرتے ہوئے ایک شناسا نے سلام کیا تو اس نے بمشکل ایک خفیف سے تبسم سے جواب دیا۔

آخر کار وہ خط جیب میں ڈال کر کمرے سے باہر نکلا اور چھوٹے سے پیش دالان سے ہوتے ہوئے اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ مہینوں سے داخل نہیں ہوا تھا اور درحقیقت اسے اپنے باپ کے کمرے میں جانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی، کیونکہ کاروبار کے سلسلے میں وہ روز ایک دوسرے سے مل لیتے تھے اور دوپہر کا کھانا طعام خانے میں ساتھ ہی کھاتے تھے۔ ہاں البتہ شامیں وہ اپنے اپنے طور پر گزارتے تھے لیکن وہ بھی جب جارج اپنے دوستوں یا چند دنوں سے اپنی منگیتر کے ساتھ باہر جاتا۔ جو اکثر ہوتا تھا۔ ورنہ باپ بیٹے دونوں ملاقاتی کمرے میں بیٹھے ہوئے کچھ دیر کے لئے اپنے اپنے اخباروں کا مطالعہ کرتے۔

جارج کو حیرت ہوئی کہ اتنی روشن صبح میں بھی اس کے باپ کا کمرہ کتنا تاریک تھا، مختصر سے صحن کے اس کنارے

کی اونچی دیوار نے اس کمرے پر اتنا زیادہ سایہ کر لیا تھا۔ جارج کا باپ دریچے کے قریب ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا جہاں جارج کی مرحوم ماں کی کئی یادگاریں لٹکی ہوئی تھیں وہ بصارت کے ایک نقص کی وجہ سے اخبار آنکھوں سے ایک طرف کو ہٹائے ہوئے پڑھ رہا تھا، میز پر صبح کے ناشتہ کا پس خوردہ پڑا ہوا تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ بہت کم کھایا گیا ہے۔ "اوہو جارج" اس کے باپ نے اس سے ملنے کے لئے فوراً اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے قدم بڑھے تو وزنی ڈریسنگ گاؤن اس کے جسم سے لپٹا ہوا پھڑ پھڑایا۔ میرا باپ اب بھی کیا توی ہیکل آدمی ہے" جارج نے دل میں سوچا۔ "یہاں بڑی ناقابل برداشت تاریکی ہے" جارج نے بلند آواز سے کہا۔

"ہاں کافی تاریکی ہے" اس کے باپ نے جواب دیا

"اور آپ نے دریچہ بھی بند رکھا ہے"

"مجھے اسی طرح اچھا لگتا ہے"

"باہر اچھی خاصی گرمی ہے" جارج نے گویا اپنے پہلے جملے کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

اس کے باپ نے ناشتے کے برتن میز پر سے ہٹائے اور انھیں ایک طرف رکھدیا، جارج نے جو اپنے باپ کی حرکات و سکنات کو خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہنا شروع کیا "میں دراصل صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں اب اپنی منگنی کی اطلاع پیٹرس برگ بھیج رہا ہوں" اس نے اپنی جیب سے لفافہ ذرا سا باہر نکالا اور دکھاتے ہوئے پھر واپس ڈال لیا۔

"پیٹرس برگ کو؟" اس کے باپ نے پوچھا

"ہاں میرے دوست کو" جارج نے باپ سے آنکھیں ملانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کاروبار کے اوقات میں یہ کتنا مختلف ہوتا ہے۔ جارج سوچ رہا تھا۔ یہاں اب وہ سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے کرسی پر کس مضبوطی سے بیٹھا ہوا ہے۔

"اوہ، ہاں تمھارے دوست کو" اس کے باپ نے الفاظ پر عجیب طور پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"دراصل آپ جانتے ہیں میں پہلے اسے اپنی منگنی کی اطلاع نہیں دینا چاہتا تھا صرف اس کے احساسات کا خیال کرتے ہوئے ورنہ اور کوئی وجہ نہیں تھی ورنہ آپ خود جانتے ہیں وہ بڑا مشکل آدمی ہے، پھر مجھے خیال آیا ممکن ہے کوئی اور شخص اسے یہ اطلاع پہنچا دے، گو وہ کچھ ایسا گوشہ نشین قسم کا آدمی ہے کہ کسی دوسرے سے اسے میری منگنی کی خبر ملنا قرین قیاس نہیں تھا، اور میں اس کا تدارک بھی نہیں کر سکتا تھا، لیکن دینے میں اپنی طرف سے اسے یہ خبر ہرگز نہیں دینے والا تھا۔"

"اور اب تم نے اپنا خیال تبدیل کر دیا ہے"؟ اس کے باپ نے لمبا چوڑا اخبار دریچہ پر رکھا اور اخبار پڑا پنی عینک کو ایک ہاتھ سے ڈھانپتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں میں اس بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اگر وہ میرا اچھا دوست ہے تو میری منگنی کی خبر سے اسے بھی خوش ہونا چاہئے، اس لئے اب اسے یہ اطلاع دینے میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیئے، لیکن خط پوسٹ کرنے سے پہلے میں نے آپ کو بتانا چاہا۔"

"جارج" اس کے باپ نے اپنے پچوپنے منہ کو لمبا کرتے ہوئے کہا "دیکھو تم میرے پاس اس معاملے پر گفتگو کرنے کے لئے آئے ہو، یقیناً یہ تمہاری سعادت مندی ہے لیکن یہ کچھ بھی نہیں ہے، یہ قطعاً بیکار ہے اگر تم مجھے پوری سچائی سے ہر بات نہ بتاؤ، میں ایسی باتیں چھیڑنا نہیں چاہتا جن کا یہاں ذکر نہیں ہونا چاہیئے، تمہاری عزیز ماں کی موت کے بعد سے یہاں کچھ ایسی چیزیں ہو رہی ہیں جو ٹھیک نہیں ہیں، ان کے بارے میں گفتگو کا موقع آئے گا اور شاید ہماری توقعات سے جلد ہی آئے گا۔ کاروبار میں کئی ایک ایسی چیزیں ہو رہی ہیں جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ چیزیں مجھ سے چھپا کرنہ کی جا رہی ہوں، میں یہ نہیں کہتا میں اب تمام کام کاج سنبھالنے کے لائق نہیں رہا، میرا حافظہ جواب دے رہا ہے کئی ایک چیزیں میں دیکھ نہیں سکتا ایک تو عمر کی وجہ سے فطری طور پر یہ کمزوریاں آ رہی ہیں اور دوسری وجہ تمہاری عزیز ماں کی موت ہے جس کا صدمہ تمہارے مقابلے میں مجھے زیادہ ہوا ہے، لیکن اب جبکہ ہم اس خط کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں تو میں تم سے درخواست کرتا ہوں جارج، مجھے دھوکہ مت دو۔ یہ بہت معمولی معاملہ ہے، بے حد ناقابل ذکر اس لئے مجھے دھوکا مت دو کیا سچ مچ پیٹرز برگ میں تمہارا یہ دوست ہے"؟

جارج پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا "میرے دوستوں کی پرواہ مت کیجئے ایک ہزار دوست بھی میرے باپ کی جگہ نہیں لے سکتے۔ میں بتاؤں، میں کیا سمجھتا ہوں؟ آپ اپنی دیکھ بھال برابر نہیں کر رہے ہیں لیکن بڑھاپے کا ضرور خیال رکھنا پڑتا ہے، میں آپ کے بغیر کاروبار نہیں چلا سکتا، اس کا آپ کو اچھی طرح علم ہے، لیکن اگر کاروبار آپ کی صحت پر اثر انداز ہو رہا ہے تو میں کل ہی اسے بند کر دینے کے لئے تیار ہوں، ہمیں آپ کی طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی اور ایک مکمل تبدیلی۔ آپ یہاں اندھیرے میں بیٹھے رہتے ہیں، حالانکہ ملاقاتیوں کے کمرے میں خوب روشنی ہوتی ہے، اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کی بجائے آپ برائے نام ناشتہ پر اکتفا کرتے ہیں، آپ دریچہ بند کر کے بیٹھتے ہیں، حالانکہ تازہ ہوا آپ کو کتنا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ نہیں ابا میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں اور ہم اس کے مشوروں پر عمل کریں گے، ہم آپ کا کمرہ تبدیل کر دیں گے، آپ سامنے میرے کمرے میں آ جائیں میں یہاں منتقل ہو جاؤں گا، آپ کو کوئی فرق نہیں معلوم ہوگا، یہاں کی ساری چیزیں آپ کے ساتھ اس کمرے میں آ جائیں گی

بقیہ ۱۵۷

تین افسانے

۱. نیلی آنکھیں

۲. اترائی

۳. زندگی کا گھونٹ

یہ افسانے تیرہ سال پہلے کے زمانے کا غیر فطری انتظار کرتے رہے، یہ افسانے ان رسالوں کی امید میں پڑے رہے جو تیرہ سال پہلے ہوا کرتے تھے۔ جب ایک افسانہ چھپتا تھا اور افسانوی ادب ایک منزل آگے چلا جاتا تھا، منزل سے منزل تک سست رفتاری اسی زمانے کو شاید زیب دیتی تھی۔ آجکل زمانہ ہے تیز رفتاری کا، جدھر دیکھو رنگے رنگ کے افسانے ہیں، ڈھنگ ڈھنگ کے افسانے، نئی کسوٹیاں ہیں نئے فتوے ہیں آزادی ہے۔ مثلاً افسانہ اب ایک کہانی ہے، اور کہانی کی تاریخ اپنے ملک میں پرانی ہے، اگر آپ یہ سنانے بیٹھیں کہ افسانہ باہر سے آیا ہے، ادب کے اس سنجیدہ شعبے کی اپنی حدود ہیں، اس کا ایک مخصوص فن ہے تو آپ سے فوراً پوچھا جائے گا کہ آپ کون ہیں۔

۶۶

پریم ناتھ در

یکایک ہوائیں جان سی آگئی، جھجکتے، سہمے جھونکوں کی جگہ ہوا کا ایک بالغ سلسلہ سا اطمینان کے ساتھ چلنے لگا اور بید کے کمزور پتے میرے سر پر گرنے لگے، پھر چونکہ ہوا کو بھی ہوا کی تھپکی مل گئی تھی یہ مریل پتے بھی تیر کے سر سے ڈھلک کر پانی کی نئی تیزی ہی میں پتھرے دکھلاتے بہہ گئے، ادھر ڈل کے شمال مغربی کونے سے پہاڑ پھلانگ کر بادل کی ایک چوڑی بیل سی چڑھ آئی تھی جس نے سورج کو ڈھانپ تو نہیں دیا تھا، لیکن اس پر ایک آنچل سا ڈال دیا تھا جس کی تہیں کہیں گھنی تھیں، کہیں ہلکی، یوں تو آسمان کا آسمان اتنا صاف تھا جیسے ڈل ہی اتر کر منہ دھو کے ابھی ابھی اوپر چلا ہو اور لگتا بھی تھا کہ ڈل اور اس کے آسمان میں کوئی بات ضرور ہے، کیونکہ دیکھتا ہوا آدمی اس وقت یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ ڈل کی نیلاہٹ اپنی ہے کہ آسمان کی، اتنی ہولے ہی پانی کے ہموار پھیلاؤ میں سلوٹیں پڑ گئی تھیں اور اضطراب کی سفید چمک میں بھی نیلاہٹ کی گہرائی ابھرتی تھی۔

حسن جمود کے تماشائی اپنی اپنی کشتیاں نیم جاں ناؤں کی طرف نکال چکے تھے اور ڈل کا پانی بھاری بھاری پہاڑوں کو رقص میں لا چکا تھا، شمال مغربی آنچل کی سب تہیں گھنی ہو چکی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ اب ایک آندھی آئے گی، اوپر کی نیلاہٹ ڈھک جائے گی، نیچے کی پاگل ہو جائے گی۔ اور انسان کی کشتیوں کو ہی کیا جھیل کا پانی میل کے ذرے ذرے کو نکال پھینکے گا، اپنی قوت کو گہرائیوں سے اچھال کر پہاڑوں کو للکارے گا اور قطروں کی یہ متحد شہنشاہی اور اس ہولناک حسن کا نظارہ بید کی ٹہنیوں کے نیچے بیٹھے بیٹھے ہی مجھے دیکھنے کو ملے گا، اور میری نظر ایک بہتے زلزلے، ایک طوفان کی امید میں پانی کی وسعت کو کھوجنے لگیں

دور پرلے کنارے کی دھندلی لکیر تک بے چین پانی تھا اور کچھ نہ تھا، شمال مشرق میں صرف ایک گہرا دھبہ بہتا ہوا دکھائی دیا، لیکن لگتا تھا کہ بے کار گھاس نہیں جسے ڈل کا پانی اٹھا کے پھینک دے، دھبے میں عزم تھا، اپنی حرکت تھی، اور کچھ لمحوں کے بعد ہی پانی کی سلوٹوں کو چیرتی ہوئی کشمیر کی ایک ایسی چھوٹی کشتی ابھر آئی جس پر نہ چھت ہوتی ہے نہ بیٹھنے کا آرام، کشمیری شکارے کے سامنے اسے کشتی بھی نہیں کہا جا سکتا، شکارے

کے ساتھ اس کا کیا مقابلہ؟ شکارے ایک کشش کو لے کے چلتے ہیں۔ پرندوں، گھوڑوں، اسپرنگوں کی لوریاں لے کر سیاحوں کے لئے، پرذوق شیدائیوں کے لئے تھکے ہوئے انسانوں کے لئے۔ اور یہ چیز تو ڈل کی محض بجریاں اٹھانے کو، مچھلیاں بچانے کو یا پانی کا پردہ بھی اچھال کر جا گشن کسان گھر درے تختوں سے بنا لیتا ہے اور کم بخت اس کے سروں پر نوک تک نہیں رکھتا۔ اسی لئے ایسا لگتا ہے کہ اس پر دونوں سروں سے نہ جانے کس کی مار پڑی ہے اور اسی لئے دور سے یہ ایک کشتی نہیں ایک دھبہ دکھائی دیتی ہے۔

طوفان کا ایک واضح اعلان تو ہو چکا تھا۔ لیکن طوفان اپنے پہلے قدموں پر ہی جا رہا۔ یوں تو اپنے ایک اشارے سے ہی ڈل نے اپنا میدان خالی کروا دیا تھا لیکن اس چھوٹی سی کشتی کی یکساں تحریک سے ایسا لگتا تھا کہ میل کا یہی دھبہ ایک شفاف زلزلے کو تھامے رہا ہے کشتی سلوٹوں کو دبا رہی ہے اور انہیں ابھرنے دئے بغیر ایک مشین کی طرح چلی آ رہی تھی ایک سیدھی لکیر میں ڈل کو دو ٹکڑوں میں کاٹتی ہوئی نہ دائیں نہ بائیں ایک حرکت ایسی نہیں جو کنارے کی طرف جھک جائے ایک چپو ایسا نہیں جو نالے کی طرف مڑ جائے — اتفاق سے وہ سیدھی لکیر اسی کنارے کی طرف چلی آ رہی تھی جس پر بید جھوم رہے تھے، کشتی کنارے لگی لیکن مجھے کچھ دور ہیں یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ کشتی چلانے والا کوئی نہٹا جوان ہوگا لیکن اپنے بید کے نیچے بیٹھے بیٹھے ہی میں نے کشتی کے سرے پر ایک عورت کو دیکھا، عورت! طوفان کا پیٹ چیرنے والی! ایسے کہ دیکھے بنا رہا نہ گیا، کنارے پر وہ کچھ جھکے بھی لگی تھی اور ایک آدھ کا ہک گھڑا تھا۔ میں نے بھی سوچا کر دیکھوں کیا بیچنے آئی ہے۔

دیکھا کہ ٹوکری پہ آنکھیں جھکائے بیٹھی ہے، پوپلے ابھر رہے ہیں اور خاموش ہونٹ ایک پتلی پتلی کسی کسی لکیر پہ کھنچ رہے ہیں، لیکن اس نے جونہی آنکھیں اٹھائیں اس کے ہونٹ دائیں بائیں پھیل کر جیسے گم ہو گئے اور پلکوں سے دیکھی ہوئی ایک دنیا کے سامنے اٹھے، منہ کھولا تو لکیر کہاں؟ جھریاں سی ڈھیلی پڑ گئیں اتنا چوڑا منہ اس لکیر کے نیچے کہاں دب گیا تھا، اس کی ایک نظر نے میرے دل کے ہونٹوں پہ ہونٹوں کے خیال کو بھگا دیا اور جب میں نے اس کی بانہوں پر پھیلی ہوئی نیلی رگوں کو بھی دیکھا۔ میں نے اسے مائی پکارا اور پوچھا "کھو مانی کیا بیچ رہی ہو؟" "ڈل کا کلیجہ! پانی کی کھیتی میں سے کیا نکلے گا؟ یہ تو بھائی کینہ بوب" — "کینہ بوب! ارے کینہ بوب" بیس برس کے بعد میں نے ایک اچھے بچے کی طرح کینہ بوب کو پایا، گول بھرے بھرے کینہ بوب کے رو برو میری انگلیاں بھری بھری نرمی کو لمس کا اشتیاق

ما۱ یہ ایک کشمیری پھل کا نام ہے جس کا ڈنٹھل جھیل کے پانی سے اوپر اٹھتا ہے، ڈنٹھل کے سر پر ایک گول آنکھ کے ڈھیلے جتنا پھل "کینہ بوب" لگتا ہے، میں نے اسے میدانی جھیلوں میں دیکھا نہیں ہے، نہ اس کا کوئی میدانی نام سنا ہے۔

سے دبانے کے لئے بے چین تھیں، جیسے بیس کیا تیس برس پہلے موسم کے بیروں دبا تی تھیں، میری زبان کینہ بوب کی کھٹ مٹھی لذت کے تصور میں بے صبری کے ساتھ اپنے تالو کو چاٹنے لگی، اور میں نے بغیر دام چکائے ٹوکری میں ہاتھ کیا ڈال دیا نیلی رگوں کو اکسایا اور کینہ بوب والی نے اپنے ہاتھ سے ہاتھ کو میری انگلیوں میں گاڑ دیا، دو گول گول بھرے کینہ بوب کو ایسی ترشی سے واپس نکالا جیسے انگلیوں میں لگی ہوئی تری کو بھی چھیل کر لینا چاہتی ہو، وہ ہونٹ کتنے کھلے ایکاں کہا گھمسلو کیا کیا کہا اس نے "مفت کا مال نہیں جو یونہی بانٹتی پھرے مال پیدا لگے ہیں یہ محنت لگی ہے، ڈالی کو پانی دینا کیا ہے؟ جانیں لے جاتا ہے دن بھر کی محنت کا پھل یہی ہے، دن بھر کی ضرورتوں کا ذریعہ یہی ہے وہ یونہی رلتی چلتی عورت نہیں ہے"

مجھے لگا یہ عورت وہ ہے کہ ڈل کی بیتابی کو بھی بند رکھتی ہے، اور اس کا کلیجہ بھی نکالتی پھرتی ہے، سوچا کہ کینہ بوب کھانا ہے تو صبر سے کام لو۔ میں نے اپنے پیر پھر پانی میں ڈال دئے، اور کنارے پر بیٹھ گیا۔

"جب تم نے وہ کینہ بوب میرے ہاتھ سے اس طرح چھین لئے" مجھے سوجھی کہ میں اسے تھوڑی سی شرم دلاؤں پھر آگے چلوں

"نہیں چھینتی، تم نے مفت کا مال سمجھا تھا" اس نے منہ کو ایک ہی طرف چھوٹا کر کے پوری نفرت سے کہا۔

"ارے تو میں کب بنا دام چکائے کھانے لگا تھا"

"دام کب چکائے تھے، تم تو کھانے لگے تھے"

"کھانے بھی لگا تھا" ———؟

"اور نہیں تو کیا؟" وہ ایسے بولی جیسے نیلی رگوں نے ڈل میں ایک چوکس کے مارا ہو۔ ایک لمحہ میں اسے گھورتا رہا اور خاموشی کے اس لمحہ میں اس کا منہ بند ہو گیا، ہونٹ ایک پتلی لکیر میں کھنچ گئے، پپوٹے پھر ابھر آئے اور جب اس نے آنکھیں ترچھی کر کے اٹھائیں مجھے ایسا لگا کہ آنکھ کے کونے سے ایک چھوکرا سا کھلنے والا ہے اور اس نے آنکھیں پھر جھکائیں، کچھ نیچے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آ گئی

"مجھے تو ایسا لگا تھا کہ چھلکا اتارے بغیر ہی کھا جاؤ گے" اس نے کہا۔ دیانتداری کا ایک وعدہ تھا کہ جھجھک کر کھلنے کی امید ــــ میں نے اس سے سچ سچ کہا "کینہ بوب کے سامنے میں واقعی اتاولا ہو گیا تھا"

"کیوں؟" اس نے فوراً ہونٹوں کو گانٹھ سی لگا دی

"پورے بیس برس کے بعد آج ان کو دیکھا ہے"

"کیوں؟ تم کہاں تھے بیس برس"

"ہیں، ہیں" مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ یہ عورت شاید مجھ ہی سے پوچھ گچھ کرنے لگی ہے، "ہاں میں گھر سے
دور چلا گیا تھا ـــــ کشمیر سے دور"

"ہاں! مگر کینز بوب کیسے دیتی ہو؟"

"کینز بوب چھنگے ہے، مگر یہ بتاؤ تم بیس برس کیوں نہیں لوٹے؟"

کینز بوب چھنگے ہے! میری ماں تو چاول کے ٹوٹے سے لیتی تھی بھر ٹوٹا دیتی تھی اور لونگن[1] بھر کینز بوب لیتی تھی"
گئے وہ دن بھائی، آجکل کشمیر کے گھوڑے تک ثابت چاول کھاتے ہیں، تو تم چڑیاں بھی نہیں کھاتیں، لیکن تم یہ
کیوں نہیں بتاتے کہ تم بیس برس کیوں نہیں لوٹے، تمہاری ماں نے نہیں بلایا تمہیں؟"

"وہ جب مر گئی تھی تب ہی چلا گیا تھا" ــــ کینز بوب والی نے ایک ہاتھ سے چپو کو گاڑ دیا تھا، چپو اچانک
ہاتھ سے نکل گیا، اور وہ پانی کے بہاؤ سے چپو کو نکالنے کے لئے جھکی اور کشتی کی کشتی ہلی اور کنارے سے الگ ہو گئی۔
مجھے ڈل کی سلوٹیں اسی جماعت کی لگتیں جیسے پہلے لیکن بادل کی چھڑی ہیں اب کہیں پر گھنی نہیں تھی۔ یہ تسلی
ہے کہ کالے آندھی نہیں آئے گی، وہ ایک ننھے سے بچے نالوں سے نکل کر ڈل پر ہچکولے کھا رہے تھے، کینز بوب والی نے
کشتی پھر سے کنارے لگائی، اب چپو کو گاڑے رکھنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ اس نے کشتی کے سرے کو کنارے پر
اتنا بڑھایا تھا کہ جیسے اس کی منزل آ گئی تھی، اس نے اپنے پھیرن کے چوڑے آستین جو کہنیوں سے اوپر پلٹے ہوئے
تھے، کھول دئے پھر بانہوں کو ڈھک دیا، اس نے اپنے دوپٹے کی گانٹھ بھی کھولی اور دوپٹہ اس کے کانوں پر سے
ہوتا ہوا اس کے کندھوں پر ڈھلک آیا

پورے بیس برس کشمیر سے باہر رہا اور بیس برس سے میں نے اپنی چہیتی شنشر[2] کا ختم نہیں کچھ لوٹ کر اپنا ایک کینز
بوب نہیں کھایا" کینز بوب والی نے پہلوؤں کا رخ بدلا [illegible] اور چہرہ [illegible] میری طرف ایسے دیکھنے
لگی جیسے میری آنکھوں میں میرے چھوٹے بچے کو آنکتے ہی ہو، بچپن کی یادیں کینز بوب چھلکوں کے اندر سے چھوٹ نکلنا چاہتے
تھے، کیا تناؤ تھا ان کا، کیسا ٹوٹیل ڈول تھا

میں نے ٹوکری سے پھر آنکھیں اٹھائیں اور دیکھا کہ اس کی آنکھ میں اب دیکھی ہوئی دنیا کے وہ سارے رنگ تھے۔
دیکھتی تھی، وہ مجلس تھا، آنسو کے ایک چھپلے ہوئے قطرے کا پردہ، چمکتا ہوا "اب تم رونے لگیں"

---

(۱) لونگن: چاول ناپنے کا لکڑی کا برتن، جس میں ایک وقت ڈیڑھ سیر کے قریب آتا ہے۔

(۲) شنشر: [illegible] (علاقہ و م)۔

"کیا کہا؟ رونے لگی ہوں؟ تم تو سچ مچ — تم تو سچ مچ ....." وہ ہنسنے لگی اور میں سمجھ کی اس کوشش میں کھو سا گیا کہ وہ ہنستی ہی ہے کہ اپنے شعلوں کو بلا رہی ہے جن سے وہ پگھلتا قطرہ ہی کیا، ڈل بھر سوکھ جاتا —— "تم تو واقعی بھولے بھالے ہو — لیکن تم تو کینہ بوب کی بات کر رہے تھے، تو کھاتے کیوں نہیں — اٹھاؤ — اٹھاؤ — جی چاہے جتنے کھاؤ — کھاؤ تمھیں میری قسم ہے، کھالو، میرا کلیجہ کاٹ دے جو نہ کھائے۔" میں آنکھوں کے کونوں کو دیکھتا رہا، جہاں سے جھرجھرا کر کھلنے کی امید ہو گئی تھی، مجھے ڈل کی طرف نظر اٹھائے بغیر ہی موسم میں خوشگوار تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا، کہ یکایک اس کی آواز میں ترشی آگئی "اٹھاؤ، کھاؤ" آنکھوں میں پھنکار پھر جم گئی تھی، اور میں نے ٹوکری میں سے دو ایک کینہ بوب اٹھائے کم بخت کینہ بوب ملا تو ایسے عجب ہیں یہ پریشانی تھی کہ بات کوئی ضرور ہے جو بھرے بھرے پھولے جھلکتے ہی سوکھ جاتے ہیں کہ نیلی رگوں نے ہی بانہوں کی گولائی کو گانٹھیں لگا دی ہیں کہ نظروں میں جو ٹھہراؤ ہے وہ پرانا نہیں کہ آنکھوں کے کونوں سے جو کبھی کبھی جھرجھرا کر سا کھل جاتا ہے، اس کے پیچھے کوئی گھٹ رہا ہے، کینہ بوب والی مجھے ایسے گھور رہی تھی جیسے وہ مجھ سے مایوس ہو گئی ہو — میں ایک چھیلے ہوئے کینہ بوب کو بڑی بے رخی اور سستی کے ساتھ منہ میں ایک طرف سے دوسری طرف کو لڑھکا رہا تھا، بولی۔ "تم کینہ بوب پر ٹوٹ رہے تھے،

"اب رغبت نہیں —!"

"اب کیا بات ہو گئی وہ —— تم تم — ...... تم ...... میرے دل کو ٹھنڈک پہنچانا چاہتے ہو تو ان کو نوچ نوچ کے کھاؤ۔"

میں نے بوب کی ٹوکری کو پیچھے ہٹا کر اسے کہا، "بہن بتاؤ تم کہاں رہتی ہو؟"

"میں" اس نے ڈوپٹے کو پیچھے کی طرف فوراً گانٹھ لگا دی اور آستین الٹ دئے اور ٹوکری کو میری طرف دھکیلا "اٹھاؤ جتنے اور لینے ہیں مجھے گھر جانا ہے، جو بچیں گے انھیں میں کل بیچوں گی، تو اٹھا لو"

میں نے ٹوکری کو پھر اپنے سامنے سے ہٹا کر پوچھا — "کینہ بوب والی! تمھیں کس بات کا دکھ ہے؟"

"دکھ؟" اس نے حیرت میں آنکھیں کھولیں "دکھ ہو میرے دشمنوں کو — اے میرا کلیجہ پھڑکا ہے، تم مجھے نہیں جانتے میں کسی کا حال نہیں پوچھتی، کسی مردنی میں نہیں جاتی، مجھے موقع ملے تو میں کسی کی دو آنکھیں نوچ لوں، اسی طرح جس طرح ڈنٹھل سے کینہ بوب اٹھا لیتی ہوں۔ تم لو ورنہ کیوں نہیں لیتے؟" وہ کشتی اور چپو کی طرف بے چینی کے ساتھ دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "کینہ بوب والی! تمھارے گھر میں اور کون ہے؟"

"اللہ تعالیٰ کا کرم ہے سب لوگ ہیں، اٹھاؤ جتنے کینہ بوب اور لینے ہیں" میں نے اپنا ایک ہاتھ ٹوکری کے کنارے پر رکھ دیا اور سوچا، شاید وہ ڈوپٹے کی گانٹھ کو پھر کھولنے لگی، شاید اس کے سینے پھر پھول اٹھیں گے، لیکن وہ لڑکی

رہی، جیسے میری ایک بات کا جواب نہیں دے گی۔ کینہ بوب والی تمھارے گھر میں اور کون ہے؟" ــــ "میرے گھر میں اور
کوئی نہیں ہے۔" مجھے احساس ہونے لگا کہ میرے پاس بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے، جو کچھ پوچھنا ہے جلدی جلدی پوچھ
لوں۔ "تمھارا گھر والا کہاں ہے؟" "وہ ڈل کے پیٹ میں!" ــــ "افسوس ڈوب گیا تھا کیا؟" میں نے جلدی جلدی پوچھا۔
"ایک روز، زور کی آندھی نے اسے اچانک پانی کے بیچ میں پکڑ لیا تھا، وہ بارون کے جنگل سے میرے لئے بند
لانے گیا تھا، کیونکہ رحمان میرے پیٹ میں تھا، آندھی اچانک آئی تھی اور میں نے اپنے کنارے پر اسے اس دغا باز کے
ساتھ لڑتے پایا۔" وہ بیک کر اٹھی اور چبو پہ جا بیٹھی، "کمینہ ڈل" اس نے کنارے پر پانی کی دیواریں اچھالی تھیں، اس
نے مجھے بھی آگے بڑھنے نہیں دیا تھا، جب میں نے رحمان کی پروا نہیں کی تھی، جب میں پڑوسی کی کشتی پہ کود نکلی تھی"
"پھر وہ ڈوب گیا تھا کیا ــــ؟" "میں نے دور ہی سے اسے ڈوبتے دیکھا تھا۔ یزید نے دکھا دکھا کے اسے لے لیا!
آندھی میں ڈل کے پانی پر مٹی کہاں اڑتی ہے؟ دھول کہاں اڑتی ہے؟ سب کچھ دکھائی دیتا ہے" ــــ میں نے
ڈل کے پھیلاؤ پر نظر اٹھائی، سلوٹیں کہاں؟ اب تو نیلے نیلے چوہے سے بھاگ رہے تھے، ہوا بھی کم ہو گئی تھی، جیسے
ادھر ادھر کہیں بھاگنے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہو۔ "پھر تم اکیلی رہ گئی تھی کیا ــــ؟" "نہیں اسی رات کو رحمان ہو گیا
رحمان اور تو ــــ"

ہاں رحمٰن اور میں ــــ رحمٰن نے تو باپ کو دیکھا بھی نہ تھا، اور میں بھی اسے بھول گئی" کینہ بوب والی کے ہاتھ سے
چونکل جاتا تھا اور وہ زمین پر لیٹ رہا تھا، نہ جانے اس کی کنپٹیوں میں اندر اندر کیا ہو گیا، کیونکہ دوپٹے کی گانٹھ
اپنے آپ کھل گئی، جب تک کہ اس نے انجانے میں اس کی ٹیک لگائی، "لیکن تم بھی کتنے بھولے ہو، غیروں کی کہانی
سننا چاہتے ہو" اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھلی، "اب تم یہ پوچھنے بیٹھو گے رحمان کہاں ہے ــــ؟ رحمان
کو بھی ڈل لے گیا۔" "نہیں تم غلط سمجھے، وہ ڈوب گیا ہے لیکن زندہ ہے!"

کینہ بوب والی، مجھے سمجھاؤ۔ تم کیا کہہ رہی ہو ــــ" "تو سنو!" اس نے اب آستین بھی کھول دی اور اپنی پتلی
رگوں کو ڈھک دیا، مسکراہٹ میں سے زہر کم ہونے لگا اور جانے کیوں مجھے امید ہونے لگی کہ جھوک کر پھر کھلنے لگا
ہے۔ "وہ میرا گھر والا بڑا عجیب آدمی تھا، ڈل کا متوالا تھا، جانے ڈل کی اس نیلاہٹ نے اس کو زندگی میں بھی
موہ لیا تھا۔ ڈل کی کھیتی سے تھک تھکا کے جب آتا تھا اور مجھے ایک بچے کی طرح گود میں لیتا تھا ــــ" کینہ بوب
والی کی آواز سوکھ گئی، اس نے آنکھیں نیچی کر دیں اور اس کے چہرے کنول کی ہوتی کلی کی طرح ابھر گئے، "جب کبھی
کے وہ سیر ہو جاتا تھا ــــ یونہی کہہ اٹھتا سوندری تو کتنی حسین ہے، بس ایک کسر ہے تمھاری آنکھیں نیلی نہیں
اس کا یہ کہنا مجھے بہت برا لگتا، لیکن وہ فوراً ہی پھر کھڑا ہوتا۔ مجھے گود میں لیتا..... اور..... اور میں نیلی آنکھوں

بات کو مذاق سمجھتی؟" یکایک اس نے آستین چڑھائی اور مجھے ایسا لگا کہ وہ کھڑی ہو جائے گی اور سر پیٹ کر چل پڑے گی

"ہاں! ہاں پھر کیا ہوا؟"

اب اس نے جیتو اٹھا کر ظاہر کیا کہ وہ جلدی جلدی سنا کر چلی جائے گی۔ اس بار میں نے خود ہی ڈل کو دعوت دی — ایک نیلی آندھی کو خود ہی بلایا۔ اور رحمان کو اس کی آغوش میں ڈال دیا۔"

"یعنی جب تب سے میں اکیلی رہ گئی ہوں، اور اکثر اسی جھیل کے پانی میں کھوجتی رہتی ہوں، کبھی کبھی گول گول آنکھوں کے ڈھیلے جیسے کینہ بوبوں کو نوچ اٹھاتی ہوں، کبھی اس کی گہرائیوں سے جل کو کھینچ لاتی ہوں، اسی آندھی کی تلاش میں بھٹکتی ہوں، اسی جگہ ڈل کے بیچ میں گھنٹوں گھومتی ہوں، لیکن بے شرم آندھی نہیں آتی۔ آتے آتے رک جاتی ہے، چار سال گھومی، چار سال یہی ہوتا رہا، آتی ہے تو میں گھر میں سر پھری ہوتی ہوں، ایسے میں روتی ہوں کہ میں گھر ہی کیوں آئی تھی اور کم بخت یہ آندھی اکثر رات کو آتی ہے جب میں بیہوشی کو کوستی ہوئی اٹھتی ہوں اور کنارے پر ہی ہاتھ ملتی رہتی ہوں پر پہنچتے ہی آندھی رک جاتی ہے اور کم بخت یہ نیلا آسمان اور یہ نیلا پانی ایسی معصوم شکلیں دکھاتے ہیں کہ جیسے رات کو نہ ہوا چلی تھی نہ ڈل میں طوفان آیا تھا — کینہ بوب والی نے چپو بھی اٹھایا، کشتی کے سر کو دھکیلا بھی لیکن نہ اس کی حرکت میں اب وہ دھکا تھا نہ مجھ میں اس کو روکنے کی ہمت تھی مگر مجھے یکایک یاد آیا کہ رحمان کی بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی۔ کینہ بوب والی! رحمان کو تم نے کس طرح —؟

ہاں — وہ میں نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑا مارا......"

"تم نے ڈل کو کیسے بلایا ہے؟"

"میں نے —!" کشتی اب سب کی سب پانی میں آچکی تھی اور کینہ بوب والی نے پانی میں چپو ڈال دیا۔ "میں گھر گھر گئی اور رحمان کے لئے ایک حسینہ نکھوں رانی دلہن لائی ہے بس وہ انھیں آنکھوں میں ڈوب گیا۔ وہ اسے لیکے گئی اور اس لئے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔"

کشتی لوٹ چلی دھیرے دھیرے دور اسی دھندلی لکیر کی طرف جہاں سے سلوٹوں پر ابھری تھی، لیکن اب ڈل کے اوپر ہوا تھی نہ پانی کی سلوٹیں، آسمان کا آسمان صاف تھا، جیسے ڈل میں اتر کر ابھی ابھی منہ دھو کے نیچر جاگ گیا ہو۔ اور اب یہ بات پہلے سے زیادہ صاف تھی کہ ڈل اور اس کے آسمان میں کوئی بات ضرور ہے، کیونکہ کوئی بھی آدمی یہ نہیں بتا سکتا تھا ڈل کی نیلاہٹ اپنی ہے کہ آسمان کی۔

ڈل اور زیر آب پودے۔

گھاٹیوں سے اوپر ایک عدد چھ گاؤں کی سرحد تھی، جہاں سے دھرتی گھوم گھوم کر نیچے گرتی تھی، سرحد پر ایک پتھر تھا جس پر سدرشن پنڈت ٹانگیں لٹکائے صبح سے بیٹھے تھے، بیچ کا چڑھا ہوا سورج پچھلے دیوداروں کے بھی پیچھے چلا گیا تھا لیکن وہ اس پتھر سے ہلے بھی نہیں تھے جیسے پتھر کا کھردرا پن ان کو راس آگیا تھا۔

اس جانی پہچانی اترائی میں سدرشن پنڈت کے سامنے آج ایک دنیا گرتی چلی جا رہی تھی، نیچے، بہت نیچے جہاں سے دائیں بائیں سبزے کی پٹ جیسی مٹیالی پگڈنڈیاں چکر کھاتی اسی پتھر تک آ رہی تھیں۔ سدرشن پنڈت پتھر پر بیٹھے بیٹھے صبح سے دھرتی کی اسی چال کو گھور رہے تھے، ان کی نظر گھوم گھوم کر نیچے تک کھوجتی جاتی اور پھر کھا کر لوٹ آتی تھی، لیکن اس ہریالی کی تہہ میں مٹی کی ڈھیریاں تھیں اور کچھ بھی نہ تھا۔ مٹی کی دھاریوں میں کہیں کالا داغ تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سدرشن پنڈت کو سورج کے ڈھلنے کا دھیان تب بھی نہ آیا جب سر پر سے دھوپ چلی گئی اور ٹھنڈی ہوا پگڑی کی تہوں میں گھسنے لگی۔ انھیں ہوش آیا جب اس ہری ہری مٹیالی اترائی پر پچھلے دیوداروں کے لمبے لمبے سائے پھیلنے لگے، اس وقت کے احساس کے ساتھ ان کی گردن پیچھے کو مڑی، جہاں دیودار کے قدموں میں گاؤں تھا اور گاؤں کے سامنے پنڈیا کا منبو تھا۔ —— وہ اچھل کر اٹھنا چاہتے تھے لیکن انھیں ایسا لگا جیسے پتھر ان کے جسم کو اپنا چکا ہے۔ اور انھیں اٹھنے نہیں دے رہا...... ان کی سن ہوئی بوٹیاں جاگ کر انھیں جیسے کاٹنے لگیں، ذرا سی حرکت کے ساتھ انھیں اب ایسا لگا جیسے پتھر اب ان کے نیچے پتھر نہیں لوہے کی نوکیں ہیں، اپنی بوٹیوں کو لوہے سے چھین کر انھیں کھڑا ہونا پڑا لیکن پتھر سے الگ ہوتے ہی ان کا گوشت اندر اندر رینگنے لگا اور ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ سدرشن پنڈت ایک بچے کی طرح رونے لگے

خود پنڈت سدرشن رو رہے تھے جنھیں پتھر کی آگ بھی کبھی نہ رلا سکی تھی، انھوں نے راتوں میں لمبے لمبے جاپ کئے تھے، منوں لکڑی کی اگنی جلائی تھی، اور لمبی لمبی بیٹھکوں سے کب گھبرا سکے تھے اور جل دائیں اگنی جیسی چیز دو میں

تو وہ بہتے ہی تھے، وہ پتھر بھلا انھیں کیا رلاتا۔

سدرشن پنڈت اسی ایک گاؤں کے نہیں دس گاؤں کے پروہت تھے، دس گاؤں میں نہ کوئی ان کے آشیرباد بنا جنم لے سکتا تھا، نہ ان کے ہاتھ لگائے بنا پرلوک جا پاتا، دس گاؤں میں ان کا دور دورہ تھا، اور دس گاؤں کا مستقبل ان کے پرچوں میں لکھا ہوتا تھا۔ سدرشن مہاراج پنڈت تھے، پروہت تھے، جوتشی تھے، گورو تھے، ایسے جیوتشی جن کے منتر گرہوں پر لگام لگائیں، ایسے گورو جن کی پوجا ڈوں سے مہاپاپوں کا پرائشچت ہو جائے جو یوگی کا انوشٹھان کرکے مہاکال پر پہرہ لگائیں اور بھیرؤوں کو بس میں لاکر جل تھل اور آکاش میں قیامت مچادیں۔

پنڈت سدرشن — گورو سدرشن نے ایک آندھی میں اپنے انھی کو دیکھ لیا، اور آنسو پونچھ لئے، ان کی نظر پچھلے تہو پر سے اچٹ کر ان کی اپنی جھونپڑی پر جا رکی، جھونپڑی یا دس گاؤں کا گورودوارہ — جس میں صرف گورو ہی نہیں ان کے ٹھاکر بھی رہتے تھے، وہ پو پھٹتے ہی اپنے ہاتھوں سے اپنے ٹھاکر کی پوجا کرتے تھے ایسی پوجا جو کیٹوں کے گھروں میں سال بھر کہیں ایک بار ہو سکتی تھی۔ اور کیٹوں کی زندگی میں ایک بار بھی نہیں، اس جھونپڑی میں پشتوں کی پاکیزگی تھی، دھوپ دیپوں کا آسمانی دھواں تھا جس میں دیوتاؤں کی خوشبو تھی۔ اور وہی سالگرام تھے، جنھیں سدرشن کے پردادا نے ایک بار خواب میں دیکھ کر چشمے سے نکال لیا تھا اور پشتوں سے جن کی پوجا کی تھی — اس گھر میں وہ وہ پوتھیاں تھیں جن کی جلدوں پر کم از کم چار پشتوں پرانے کپڑے تھے اور گھر کی اگنی کبھی بجھی نہ تھی، ٹھاکر جی کا دیپ جانے کب سے جلتا ہی رہتا تھا۔ بھوسے کے نیچے تھیں تو وہی کاٹھ کی ہنڈیاں۔ لیکن اس گائے کو برسوں سے لیپ لیپ کر خود پدما کے ہاتھوں نے امر کردیا تھا۔ پدما......!

سدرشن پنڈت دیکھتے ہی دیکھتے اندھے سے ہونے لگے، دیکھتے ہی دیکھتے ان کی نظروں میں وہ پشتوں کی جھونپڑی بھوسے کے نیچے دب گئی، سالگرام لڑھک گئے، دھوپ کا نہیں جلتی ہوئی پوتھیوں کا دھواں آگے پیچھے دنیا پر چھانے لگا۔ ٹھاکر......! سالگرام......!! پوتھی......!!!،

دنیا بھر جلے تو جل جائے لیکن — ؟

"لیکن بھئی حوالدار صاحب! تم نے کہا تھا پدما آئے گی۔ وہ اسے لائیں گے.... دوپہر تک لوٹیں گے...... کہو میرے بھائی!.... وہ سپاہی..... وہ اتنے سارے کہاں گئے؟

"پدما..... میرے بھائی..... پدما!.....، سدرشن نے تنبو کی طرف لپک کر سپاہی کو جھنجھوڑا

"ہاں بتا کب لوٹیں گے وہ پدما کو لے کر؟ بتا کب لوٹیں گے؟؟"

سپاہی سے دلاسا لے کر سدرشن پنڈت نے رونے کو دبا دیا، اور اسی اونچ نیچ کی سرحد پر — اسی اپنے پتھر پر

دوبارہ آبیٹھے، ہریالی کے بیچ میں مٹیالی دھاریاں اب گرتی جا رہی تھیں۔ اور وہ سب کی سب سامنے میں آچکی تھیں
پنڈت سدرشن نے مل مل کر اپنی آنکھوں کو سکھا دیا اور پھر اسی اترائی کے ہیر پھیر میں کھو جنے لگے

دنیا میں یہ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ سب کچھ بھی!!۔ اور پنڈت سدرشن کو خبر تک بھی نہیں رہی ہے؟ ہے رام!!
یہ گاؤں دنیا سے اتنا الگ کیوں تھا؟ سدرشن پنڈت کو ذرا سا اشارہ بھی ملتا تو چنڈی کے پاٹھ سے وہ ان راکشسوں کا ناش کر دیتا؟ یہ ڈشٹ یہاں تک آگئے اور خبر تک بھی نہ دیا، انھوں نے، آئے رات کے اندھیرے میں روشنی کو اجاڑنے گھروں کو تباہ کرنے، اس دیوتاؤں کی گھاٹی میں۔ راکشس!! ہاں راکشس!! جنھوں نے بچوں کی چیخ نہ سنی۔ عورتوں کا رونا نہ مانا، آگ لگا دی اور...... اور اگر انھیں سب کچھ لوٹنا ہی تھا.... مگر کمینے پدما کو کیوں لے گئے
پنڈت جی اب پھر کھڑے ہو گئے اور ہانپتے ہوئے بیٹھ گئے

"بھائی حوالدار، میں کہہ رہا ہوں، پدما ابھی جوان ہے عورتوں میں سب سے چھوٹی وہی ہے، اسے تم تو چپ کھڑے دیکھ رہے ہو سورما! کہاں گئے تیرے سپاہی؟ تم لوگ جوان کے جاتے ہی آگئے تھے، ان کے پیچھے ہی دوڑے تھے، پدما کو اب تک کیوں نہیں لائے؟ پنڈت سدرشن نے سوالوں کی جھڑی لگا دی۔ لیکن حوالدار چپ تھا، سدرشن کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھاتا تھا۔ کھڑے کھڑے سدرشن پنڈت کی آنکھوں میں حوالدار کی ایک مورتی بن گئی، پھر ایک دھبہ سا رہ گیا اور دھبہ اس کے سر میں گھس گیا، پھر پتھر پر بیٹھ کر ایسا لگا کہ یہ دھبہ اس کے ساتھ کشمیری میں بولنے لگا ہے دھبے سے کشمیری میں باتیں سن کر اس نے اپنی آنکھیں پھر کھولیں، سر میں سے دھبہ کود نکلا۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا چلا۔ اور سدرشن نے حوالدار کو سامنے کشمیری میں بولتے سنا۔

یہ حوالدار اور وہ سپاہی سب کے سب کشمیری تھے، کشمیری سپاہی سدرشن نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا انھیں خیال آیا کہ کشمیر کی کنڈلی بدل گئی ہے، گرہوں کا نیا یگ آیا ہے جس میں کشمیری حوالدار بھی بن سکتا ہے اور راکشس کا پیچھا کر سکتا ہے۔ تمبو سے کسی نے رمضان راتھر کو آواز دی، حوالدار نے مڑ کر دیکھا اور "ہاں" کی۔

رمضان راتھر! ــــ حوالدار ــــ! کشمیری ــــ!! سدرشن پتھر سے پھر کھڑا ہوا اب رمضان راتھر دیودار سے اونچا ہو گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ جنگل کے سبھی دیودار اس کے پیچھے پیچھے اترائیوں کی طرف دوڑے جا رہے ہیں، ایک ایک جست میں کوسوں طے کر رہے ہیں اور ایک جنگ ہو رہی ہے، سنکھ بج رہے ہیں، نفیری بج رہی ہے، ڈھول بج رہے ہیں، پتھر اڑ رہے ہیں، اور راکشسوں کا ناش ہو رہا ہے۔ لیکن ان اترائیوں پر کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا، وہ مٹی سب کی سب مری ہوئی تھی، جانے یہ راکشس کتنی تیزی سے بھاگ رہے ہونگے اور کہاں کہاں چھپ رہے ہوں گے اور لوٹی ہوئی عورتوں کو......

"نہیں نہیں۔ پدما کو جلد ہی واپس آنا چاہیئے تھا" سدرشن پنڈت نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور وہ ایک بار اور کھڑے ہو گئے۔ ان کی جاگتی ہوئی آنکھوں میں بھیانک سپنے رینگنے لگے اور وہ پاگلوں کی طرح مچلنے لگے۔

"رمضان بھائی اب بتاؤ وہ کب آئیں گے۔؟ اب بہت دیر ہو رہی ہے ... بہت دیر ...!"

سپاہی اس وقت نیچے کی طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اندھیروں میں کچھ ہونے لگا ہو، یک لخت اس کے چہرے پر رنگ ابھر آیا اور اس نے منہ پھیر کر تمبو کی طرف تیز آوازیں دیں "ہوشیار، ہوشیار کوئی آرہا ہے" تمبو میں سے دو سپاہی رائفلیں لئے باہر نکل آئے لیکن حوالدار نے دوربین سے دیکھ کر اپنے ساتھیوں کو پہچان لیا۔

"وہی ہیں" اس نے پنڈت کے بار بار پوچھنے پر کہا۔

"رمضان بھائی دیکھو تو، دیکھو تو...... کوئی عورت بھی ساتھ ہے اور اگر یہ تو وہی پدما ہے۔ ! گرودھاں !! میرے ساتھ وہ بھی تمہیں دعائیں دیتی رہے گی ... ! میں تمہارے لئے ہون کروں گا۔ ہوری کا باپ مڑی تیار کرے گی، خوشی گرہوں کو پاٹھ کرتا ہوں میں تمہاری کبھی ہار نہیں ہوگی، دیکھو رمضان بھائی! جاپ میں بڑی شکتی ہے تم پر ماتما سے پیار کر لوں گا۔ گاؤں بھر کو پیار کر لوں گا! بتاؤ! بتاؤ!! پدما بھی آرہی ہے نا۔؟"

حوالدار نے انہیں یقین دلایا کہ سپاہیوں کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔

"لیکن یہ تو بتاؤ وہ کیسی ہے ... ؟ بھائی ذرا دیکھو کہ وہ عورت جوان ہے نا ؟"

حوالدار نے دوربین سے دیکھ کر کہا "پنڈت جی یہ تو ابھی پتہ نہیں چلتا کہ عورت جوان ہے یا بوڑھی ہے۔ لیکن عورت گھوڑے پر سوار ہے، اور گھوڑا تیز چلا آرہا ہے"

"گھوڑا" سدرشن پنڈت سوچنے لگے۔ گھوڑے پر تو کوئی بوڑھی عورت کیا بیٹھ سکے گی ... ؟ جب کہ گھوڑا تیز بھی چل رہا ہو"

سدرشن پنڈت کے کانوں میں گھوڑے کی ٹاپیں بجنے لگیں، اٹھتی ہوئی گرد سے یاترائیں ابھرنے سی لگی، دھندلا دھندلا ایک میدان سا کھل گیا اور ٹاپ ٹاپ کرتے دو گھوڑے سرپٹ چلنے لگے، جیسے اب بھی سدرشن پنڈت مرتے گئی جو ددکو ٹیکتے لا رہے تھے ... وہ آنکھیں انھوں نے ایسی کھولیں جیسے ساری دھول کو آنکھوں سے پی کر وہ ایک بار نیچے کی طرف دیکھنا چاہتے ہوں تیز گھوڑے پر تو پدما ہی آرہی تھی، ہاں وہی آرہی تھی۔ پدما پھر آرہی تھی ... سدرشن پنڈت کا سینہ ابھرنے لگا انھیں ایسا لگا کہ وہ آپ بہت بے چین ہونے لگے ہیں، وقت کاٹے نہیں کٹتا، منہ موڑ کر انھوں نے اپنی جھونپڑی کی طرف دیکھا

"اب تو یہ پوتھیاں سب کی سب پھر لکھی جا سکیں گی" انھیں ان کا ایک ایک شلوک یاد تھا، سنگرام کوئی

پوجاؤں کے ساتھ پھر اپنی جگہ پر بٹھایا جا سکتا تھا۔ پیتل کے برتنوں کی جگہ سدرشن پنڈت مٹی کے کورے برتنوں سے کام چلا سکتے تھے اور گوردوارے کو بھینٹ والی آرہی تھی۔ گورو ماں ..... گورو ..... لیکن سدرشن پنڈت کا دل پھر اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔ ان کے اندر اندھیری گپھائیں سی کھلنے لگیں۔ اگر ان دشٹوں نے ..... ان پر وشواس کیا ..... اگر پدما بھرشٹ کر دیا ہو ۔۔۔؟

سدرشن پنڈت نے فوراً منہ موڑ کر نیچے کی طرف نظر دوڑائی پر وہ ساری شئی جو آتے ہوئے چاہی نیچے سے اڑا رہے تھے، انھیں اس میں آگے کچھ دکھائی نہ دیا۔ ان کا دل بیٹھ سا گیا۔ ان کی بے چینی دب سی گئی۔ اگر پدما بھرشٹ ہو چکی ہو تو؟ پھر تو وہ سرا کُن، بھوں سے بیچے گی؟ ٹھاکر... کے لیے بھوگ بنائے گی تو وہ کس کو آشیرواد دے گی؟ اور پھر گورو سدرشن! ہاں میں پھر کہاں رہوں گا؟ میری گورائی کیسے چلے گی ..... کیسے چلے گی ..... منگل اور دا ہونے تو کہیں یہ بھی تو نہیں کر دیا! ۔۔۔ ہے رام! .....“

سدرشن پنڈت کی ٹانگیں کھڑی نہ رہ سکیں۔ بیٹھ کر وہ اپنے ہاتھ ملنے لگے کہ انھوں نے ان دو گرہوں کا اپائے کیوں نہیں کیا تھا۔؟ انھیں پتہ تو تھا کہ وہ برے ہیں، لیکن انھوں نے سمجھا تھا کہ وہ ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑیں گے۔ وہ خود جو جیوتشی تھے، کرم کانڈی اور جیوتشی ۔۔۔ انھیں دھول میں سے پھر پدما دکھائی دی، ان کی دھڑکن پھر تیز ہونے لگی۔ مٹو تیز تیز قدم اٹھاتا چڑھ رہا تھا، پدما مٹو پر اکیلی تھی، اور ایسے ہل رہی تھی جیسے زین پر سے اچھلنا چاہتی ہو۔ اسے ایک سپاہی تھامتا چلا آرہا تھا، بیچ بیچ میں وہ ایک ہاتھ کو لہراتے ہوئے کچھ بولتی سی آرہی تھی پدما اور سپاہی!

پدما ہی تو ہے وہ لیکن وہ اتنی باتونی کیسے ہو گئی؟ جانے کیا کیا دکھ بتائے ہوں گے اس کو! لیکن اس کا نکھر کتنا بھیانک کھائی دے رہا تھا ۔۔۔؟ سدرشن پنڈت وہیں سے ایک آواز دینا چاہتے تھے مگر انھوں نے اپنی آستین کو منہ میں ٹھونس دیا کہ کہیں آواز کے ساتھ رونا نہ نکلے، انھیں دھیرج رکھنا تھا، پدما کے جانے کن کن زخموں کو بھرنا تھا، جانے اسے کیا کیا ہو گیا ہو گا۔؟ ...... کیا؟ ..... کیا ..... سدرشن پنڈت کی گھٹی ہوئی آواز جیسے چھلنیوں میں سے نکل نکل کر یہی پوچھنے لگی کہ پدما پر کیا کیا بیتی ہو گی! آستین کے کپڑے چھلنیاں بھر دیں اور سدرشن کے پیٹ میں درد ہونے لگا اور دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو پکڑنے پر بھی ایک موٹا سا گیا“ ان کی آنکھوں پر چھا گیا اور اوپر آتی ہوئی پدما نیچے ہی کو گرتی دکھائی دی، پدما کا بھیانک سر اور اس کے لہراتے ہوئے ہاتھ جیسے یہی جتلانے سے تھے کہ پدما بھرشٹ ہو چکی ہے۔ بھرشٹ! ..... بھرشٹ! ..... دیو دار اور صنوبر کی چوٹیوں سے یہی آواز آرہی تھی اور دیو داروں کے سٹے بہت لمبے ہو کر جیسے پدما ہی پر انگلی اٹھا رہے تھے۔ پدما! ہاں پدما! بھرشٹ ..... بھرشٹ

لیکن گورو سدرشن نے یکایک گردن سیدھی کی اور مٹھیاں بھینچ لیں۔ جل تھل، وایو، بولتی ہوئی دنیا اس کے دانتوں کے نیچے دب گئی۔

گورو۔۔۔!.... ایک بھونچال آگیا۔ گورو۔۔۔ اس لفظ کے جیسے بادل گرجنے لگے اور پاس کے دیودار اور عدد کی چوٹیاں کانپنے لگیں۔ انھوں نے پتھر سے ہٹ کر آسمان کی طرف دیکھا، یہ آسمان بھی وہی تھا اور زمین بھی وہی تھی اور وہی جن کے وہ بھید جانتے تھے۔ اسے ایسا لگا کہ دنیا گورو کو خود پکار رہی ہے، اور اترائیاں اور چڑھائیاں اسی کے فیصلے کا انتظار کر رہی ہیں۔

"کون کہتا ہے کہ وہ بھرشٹ" ؟ دیوداروں میں سے ہوا بھاگنے لگی، مٹی تیز تیز اڑنے لگی اور پدما، ٹوپر نرمل سیتا سی آتی ہوئی دکھائی دی، اور اگر...... بادل زور سے گرجنے لگے...... اگر..... اگر کچھ ہو بھی گیا ہو اس کا کوئی اپلٹے نہیں تھا کیا

ہوا بھاگ نکلی اور مٹی بیٹھ گئی۔ سدرشن پنڈت کے سر پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا جیسے یہ اپاٹے کی بات ایک کھوئے ہوئے سدرشن نے خود بھا پنڈت سدرشن سے سن لی تھی۔ ان کے خیالوں میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا اور دل کی نئی دھڑکن کے ساتھ دماغ میں نئے اپلٹے آنے لگے۔

وہ خود پدما کو شدھ کر سکتے تھے۔ ایکادشیوں کے نراہار برت رکھوا کر، ماگھ ماس کے ٹھنڈے اشنانوں سے،۔۔۔ پانچ بوٹیوں کے پرشاد سے، جپوں سے، پوجاؤں سے، انوشٹھانوں سے اور ہر روز کی کریاؤں سے وہ اسے پھر پوتر بنا سکتے تھے، ان کے پاس ایک نہیں سینکڑوں شالیں ایسی تھیں اور سب سے بڑا گایتری کا مہا جاپ تھا۔

مٹی کے بادل جو پھر چھا گئے تھے، ایک آن میں چھٹ گئے، سدرشن پنڈت نے چڑھتے ہوئے نوجیوں میں سے ایک ایک کو دیکھ لیا، نوجیوں کے بیچ میں پدما کا سر نیچے کو جھکا ہوا نہیں تھا، پدما دس گاؤں کی گورو ماں! وہ آرہی تھی ایک دنیا پھر سے بسنے لگی تھی،۔۔۔!!

ٹوپر سے پدما کو اتارا گیا، پنڈت سدرشن نے دل کی آندھیوں کو تھام کر پدما کو بس نام سے پکارا، پدما نے ان کی طرف دیکھا نہیں، وہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی دوسری طرف ہریالی پر آبیٹھی، پنڈت سدرشن کی دھڑکن میں تیزی آگئی۔

من من بھر کا ایک پاؤں اٹھا کر وہ اس کے سامنے آکھڑے ہوئے، اور پدما نے.... پدما نے، بس اپنا پیر اٹھا کر ان سے یوں کہا جیسے وہ بھی ان سپاہیوں میں سے ایک تھے،

"دیکھنا تو اس میں کانٹے گھس گئے ہیں"

سدرشن پنڈت یہ سوچتے ہوئے کہ ظالموں نے اسے کانٹوں پر دوڑایا ہوگا۔ کانٹے نکالنے کے لئے جھکے، لیکن پاؤں

میں کانٹے تھے نہ کانٹوں کا نشان۔

"کہاں ہیں کانٹے پدما؟"

پدما نے اپنی آنکھیں ایسی کھولیں جیسے سدرشن پنڈت کی بات پر اسے بڑا تعجب ہو رہا ہو، پھر فوراً ہی اس کی ہنسی چھوٹ گئی، وہ آنکھیں کھول کھول کر ہنسنے لگی۔ سدرشن پنڈت دھرتی میں گڑنے لگے اور سپاہی چپ چاپ کھڑے دیکھتے رہے، سدرشن پنڈت کی ایک نظر پدما کی باہوں پر گئی جو سونے اور چاندی کی چوڑیوں سے لدی تھیں، انھوں نے اس کے گلے میں ایک چمپا کلی بھی دیکھی — چوڑیاں ..... چمپا کلی ...... ؟ وہ ہنسی ..... پھر کانٹے ..... اور پاؤں ..... یہ پدما کیا ہو گئی تھی؟ گوردھاں پدما ایسے

"یہ زیور کس نے دئے ہیں تمھیں — ؟"

پدما کے قہقہے اور بلند ہو گئے۔ ایک سپاہی نے آگے جا کر پنڈت سدرشن کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ انھیں کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن سدرشن ایک نئی آگ میں جھلس رہے تھے، انھوں نے سپاہی کا ہاتھ جھنجھوڑ کر کندھے سے ہٹا دیا،

"میں پوچھ رہا ہوں، یہ زیور کہاں سے پائے تم نے"

پدما نے ایک آن میں جیسے وہ ہنسی پی لی۔ اس کی آنکھوں میں سنجیدگی آ گئی، اور اس نے اپنی گردن کو کچھ ایسے کس لیا کہ سدرشن پنڈت کی دھڑکن اس تیاری میں رک گئی کہ پدما نہ جانے اب کیا کہا۔ بات کہہ ڈالے گی لیکن پدما اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی چوڑیوں کو سہلانے لگی، اور چوڑیوں سے ہی یوں بولنے لگی جیسے وہ چوڑیاں نہیں اس کے روتے ہوئے بچے ہوں،

"چپ ہو رہی بہن اے اور ی بہن، چپ رہو ری ..... اے ارے رے سے رے ر ..... تیرا گلا کٹ گیا ..... ارے خون! خون پونچھ تو ......

چمپا کلی! پر تو کہاں گئی — ؟ ..... مری نہیں ؟! ..... یہ لے تو میرے ہاتھ پر، یہ، یہ، وہ چوڑی کو سہلاتی گئی اور ...... ہی ..... ہی ..... ہی ..... ہی ..... اس کی ہنسی بھی نئے سُروں میں نکلنے لگی۔

پنڈت سدرشن نے سپاہی کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور سپاہی نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں سمجھ کانپ رہی ہے، اس نے آگے آ کر انھیں اچھی طرح سمجھانا چاہا، لیکن پدما پھر اونچی آواز میں بولنے لگی "بیچ دیدی کے پیٹ میں سے خون نکل رہا ہے۔ نکل رہا ہے۔" اور وہ ایک چوڑی کو ایسے دبانے لگی جیسے وہی بیچ دیدی کا پیٹ تھا۔

"پنڈت جی!" سپاہی نے پنڈت سدرشن کو گرنے سے تھاما۔

آپ شکر کیوں نہیں کرتے کہ یہ واپس آگئی ہے، کم بختوں نے لوٹا ہوا زیور اسی کو پہنا دیا تھا، مشکل سے بھاگنے کا راستہ ملا انھیں! زیور تک نہ اتار سکے"

سدرشن پنڈت کے ہونٹ کچھ بولنے کے لئے پھڑپھڑائے، لیکن ان کی آواز نہ نکل سکی۔ سپاہی نے انھیں تھامتے ہوئے کہا "لیکن پنڈت جی! بیوی آپ کی کمزور دل تھی۔ بہت کمزور..... بس اتنے میں ہی پاگل ہو گئی۔"

پاگل — جس کا پرائشچت نہیں ہو سکتا تھا۔ جس کا اپائے سدرشن پنڈت کے پاس بھی نہ تھا!!

سدرشن پنڈت کے سامنے اسی اترائی پر وہ تمو، وہ سپاہی وہ دیوداس، وہ گاؤں کا گاؤں، لرزتا گرتا دکھائی دیا۔ بیچے بہت نیچے..... ان کھائیوں سے بھی نیچے جن میں دن کا اجالا بھی نہ جا سکتا۔

شکستِ عہدِ ستم پر یقین رکھتے ہیں
ہم انتہائے ستم کا گلا نہیں کرتے — احمد ریاض

احمد ریاض نے بہت ہی کم مدت میں اپنی تابانیوں سے ادبی فضا کو منور کر دیا تھا اور توقع تھی کہ تابانیاں ابھی شہرِ ادب کی اور وسعتوں کو بھی ضیا افروز کریں گی کہ یکایک وہ منبع نور ہی بجھ گیا جس سے یہ روشنیاں پھوٹ رہی تھیں!

ریاض کی شاعری صحیح معنوں میں وہ شاعری ہے جسے حیات افروز کہا جا سکتا ہے حیات افروز اور حیات آموز (میرزا ادیب)

موج خوں

جواں مرگ شاعر احمد ریاض کا نمائندہ مجموعۂ کلام (زیر طبع)

مجلس یادگار ریاض۔ کچہری بازار۔ لائل پور

زندگی کا گھونٹ

قدرتی بات تھی کہ گھر سے باہر کی آب و ہوا ہی مجھے راس آتی تھی۔ گھر بھابی کا تھا چلو میرا بھی سہی۔ لیکن گھر کی چھوٹی سی چار دیواری تھی، جس میں ایک طرف وہی برسوں کے بھائی صاحب گھر میں بچوں کی سبھا لگائے، پاس بیٹھو بات کرو، جواب میں سنو تو وہی حقے کی گڑگڑاہٹ، کھانسی کی کھکار، یا دم سنبھل گیا تو بڈھوں کی باتیں، دوسری طرف بھابی اور اس کی رسوئی، وہی پیچ پیچ وہی کھنک، وہی بات بات پر بلاوے، منہ کھولو تو تیل کے سانس، ناک کھولو تو چھونک، وہی دھواں، وہی دھمک اور بڑی الجھن یہ کہ میرا وقت کھلنے کا تھا، دھوپ ہوائیں کھوجنے کا، زندگی کو ذرا ہاتھ کے دیکھنے کا، نہ کہ پتھرائی ہوئی دیواروں کو گھورتے رہنے کا۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ گھر کے ہر لمحہ میں گھٹن ہے اور بس دروازے سے نکلتے ہی زندگی کے بھرے بھرے گھونٹ ہیں، یہی وجہ تھی کہ بھابی کی پہلی آواز مجھے بری بھی نہ لگتی، میں بستر سے کود اٹھتا، لے کے لوٹا دوڑ لگاتا، آنکھ جھپکتے دودھ لے آتا، بھابی کی بندھی سبزیاں لاتا، بھائی صاحب کے ساتھ چائے کے گھونٹ اتارتا اور خالی ہو کر ایک آندھی چلاتا جوتے پہ پالش کو چمکاتا، نہاتا، کوٹ پتلون اور ٹائی کس کسا کر گھر پڑے دیور کی جگہ سنسار نواسی بابو — نام نہیں بتائیں گے — سمجھو ایک نئے آدمی کو نئے جیون کے نوجوان کو شیشے میں ٹھیک ٹھاک کر کے گھر کے سائے سے بھاگتا، جا کے بس کے اڈے پر ٹھنڈی سانس لیتا بھابی کے دیے ہوئے ردی کے ڈبے کو پیچھے پان والے کے پاس ہی رکھ دیتا، ردی کا ڈبہ بھی بھلا چیز تھی ایسی کہ ساتھ لئے پھرو؟ ساتھ لئے پھرو اور اسے بجاؤ — کہ سن لو لوگو ہم یہ ہیں، ردی کے ڈبے والے کہ جوتے کی چمک اور ٹائی کی چمتی جھوٹی ہے۔ بس کے اڈے پر میں اپنے انداز میں کھڑا ہو جاتا اور دونوں ہاتھ جیب میں ڈالے زندگی کو دل ہی دل میں جانے لگتا کہ کبھی کیو میں کھڑی لڑکیاں جانے کیا سمجھ کر اکڑتی ہوتیں، بس جھٹ سے کسی پہچان والے آدمی کو پکڑتا اس پہ تیز تیز انگریزی کی بارش کرتا اور ماحول میرے ہاتھوں میں آتا کھلی کھلی ہوائیں ایسے دس اور موقعے ملتے اور میں موقعے کو یونہی جانے نہ دیتا، اپنا دیکھ ہی لیتا۔

دنوں میں یہ بھی ایک دن تھا، وہی اور دنوں جیسا، لیکن نئی بات یہ تھی کہ نہ تو کیو میں کوئی پہچان کا آدمی تھا۔

نہ کوئی لڑکی تھی ۔ لڑکی ہی ہوتی تو دیکھتے دیکھتے بالوں کی بناوٹ پہ تنقید کا ایک فلسفہ جاگتا ، اس کے کندھوں کو دل ہی دل میں ناپتا ، بالوں کے نئے پرانے سبھی سٹائلوں کو یاد کرتا ، کھڑے کھڑے سٹائل بدلتا جاتا ، جب تک کہ وہ کندھے ہلنے لگتے کیو چلنے لگتا اور میرے دل سے بھی وہ بال اڑ جاتے ، لیکن آج سڑک کے پار بھی کوئی بات نہ تھی ، ذہن کو خالی رکھنے سے ڈرتا تھا سو وہی بات ہوئی ۔

مرا مرا سا ماحول تو تھا ہی ، آنکھیں ڈھونڈ کر تھک گئیں خیالوں ، خاکوں کا ایسا شور سا ایک سلسلہ چل پڑا کہ دل بھر آیا اور آنکھیں نم ہو گئیں ، بڑا بدشگون دن تھا وہ ایسا لگا کہ دھوئیں کی طرف لوٹ رہا ہوں ، لگا گھٹ رہا ہے کہ زندگی بھر بھی کھو جاؤں ، دل کی کلی نہیں کھلے گی ، زندگی کا گھونٹ ایک بھی نہیں ملے گا ـــــ ایسی جب آ ہی گئی پر من کی حالت بدلی نہیں ، جانا تھا اس لئے بس میں گھس گیا

بس میں دفتر تک کھڑا کھڑا گیا ، کئی اترے ، کئی چڑھے ، بیٹھنے کو جگہ تھی لیکن اس دن موڈ بنا ہی نہیں ، اس دن دفتر میں بھی میں نے بہت کام کیا ، جا کے اوروں سے فائلیں چھین کر لوگوں کا کام کیا ، یار لوگوں کے مذاق گھٹ گئے جب میری حالت بدلی نہیں ، جب دس کے جواب میں میں نے ایک بھی نہ کہی

پانچ بج گئے چھٹی ہو گئی چل پڑے ہم بھی ، لیکن آج نہ تو کیو کا دھیان تھا نہ بس کا ، یونہی جی چاہتا تھا کہ پیدل چلو پگڈنڈی پہ ہو لیا ، اپنا الگ الگ کنارے کنارے ایڈوں سے قدم بچاتا ہوا یونہی چلتا رہا ، دنیا میں ایک غیر معمولی گہما گہمی تھی ، اور میں دنیا کے کنارے پر تھا ، سائیکل والوں کی فوجیں آ رہی تھیں پہیوں پہ پہیے جیسے انھیں بجلی چلا رہی ہو جانے کن ایڈوں کا تعاقب کر رہے تھے ، سڑک پہ بسیں غراتے بھرتی آ رہی تھیں ، پھٹ پھٹیاں اودھم مچا رہی تھیں ماحول میں ایسی تیزی تھی جس کا احساس میں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا ، ہو سکتا تھا کہ میں آپ اس آندھی کا ایک تنکا تھا جو آج ایک کنارے پہ اٹک گیا تھا ،

چلتے چلتے شام بھی ہو گئی ، سردیوں کی بہار تھی اور جب اندھیرا ہونے لگا مجھے جانے یہ ڈر کیوں کھانے لگا کہ میں دنیا سے کٹ کر اندھیروں میں کھو جاؤں گا ، یہ زندگی کنارے پر آ گئی تو زندگی نہ رہے گی اگر زندہ رہنا ہے تو بیچ سڑک میں آنا ہوگا آشانیں بنائے رکھنی ہوں گی اور موقعے ڈھونڈنے پڑیں گے ایک بچے کی طرح اندھیرے سے ڈرتا ہوا میں بجلی کے کھمبوں کے نیچے نیچے چلتا ہوا رات کو دن کی طرح چمکاتے ہوئے نور محل پکچر ہاؤس پہ آ کے رک گیا ۔ خیال آ گیا کہ فلم بڑی کام کی چیز ہے ، من میں چین ہو تو فلم دیکھنے کا مزہ آتا ہے ، اگر دکھ ہو تو پکچر دیکھنے سے دب جاتا ہے سوچنے کا وقت نہ تھا ، پکچر شروع ہو گئی تھی یا ہونے والی تھی ، سوا روپے کا ٹکٹ نہیں ملا ، ڈھائی کا لے لیا اور ہال میں چلا گیا ہال میں اندھیرا تھا ، اور سکرین پہ فلم کے ابتدائی نقوش روشن ہو چکے تھے ۔

ٹارچ نے میرے نمبر کی سیٹ پر، لو انگلی رکھ دی اور میں انگریزی میں معافیاں مانگتا ہوا پیر بچاتا گھستا گیا، سامنے کرسیاں بہت خالی تھیں لیکن میرا نمبر بھی پچھلی لائن میں تھا، پہلے مجھے یہ ڈر ہونے لگا کہ میرے ڈھائی روپے اکارت گئے، فلم اچھی نہیں ہوگی، لیکن دیکھا کہ نچلا درجہ ٹھسا ٹھس بھرا ہے اور ساتھ یاد آگیا کہ یہ فلم دوسری بار آگئی ہے، اچھی ہے تبھی سوا روپے والے بھر گئے، بیٹھتا ہوا چین کا سانس لینے ہی لگا تھا کہ دائیں طرف ساتھ کی آخری کرسی پر نظر پڑی اور دل لمحہ بھر رک سا گیا، ٹارچ بجھ گیا تھا اور سکرین سے اٹھتی ہوئی دھندلی روشنی میں مجھے ایک ساڑھی اور ایک بیگ کا اندازہ ہوا، "عورت ہے تو کیا بات ہے" موڈ کے بھاری پن نے دل کی عادت کو سمجھایا، سکرین پر کہانی شروع ہوئی اور میرا دھیان ادھر لگ گیا

چڑیوں کی چہچہاہٹ اور کوئل کی کوک کے ساتھ جھومتے ہوئے ایک باغ میں ہیروئن آگئی تھی اور پھولوں کو چھوتے ہوئے ایک میٹھا گیت گانے لگی تھی، پیڑوں کی اوٹ میں ہیرو بھی آگیا، اور مجھے جانے کیوں فکر ہوگئی کہ دیکھوں یہ پاس بیٹھی ہوئی کیسے دکھ رہی ہے، کنکھیوں سے دیکھنے لگا تو نیز یادہ نہ دکھائی دیا، روشنی کیا روشنی کا سایہ سا تھا اور اس میں لکیریں تو دکھائی دیں کوئی خاکہ نہ ابھرا، یہ تو ظاہر ہوا کہ لکیروں میں تناؤ ہے نہ کہیں جھول ہے نہ جھکاؤ عورت نہیں لڑکی ہے، ادھر گیت کٹ گیا اور ہیروئن ڈر گئی، ہیرو سامنے آگیا، مسکرایا اور کہانی شروع ہوگئی، کہانی میں اتنا رس تھا کہ میں بیچ بیچ میں مسکرانے بھی لگا، یہ بھی خیال آیا کہ گھن چکر ہوں، بے بات کے اپنا دن بگاڑ دیا کوئی بات بھی ہوئی ہوتی، یونہی من کو کڑوا کیا ___ کہانی میں ہنسی تھی، لوگ ہنسے میں بھی ہنسا، پر یہ لڑکی کیوں نہ ہنسی، خاکے کی لکیروں میں کم سے کم آواز تو پڑتی، اپنے اندازے کو پرکھنے کا کوئی ذریعہ تو ملتا "چلو ہٹاؤ ہنسے روئے مجھے کیا؟" اپنے آپ کو سکرین کی طرف کر کے میں کہانی میں ہی دھیان دینے لگا۔

کہانی میں کئی موڑ آگئے، کئی مشکلیں آگئیں، پتا جی غصے میں دانت پیسنے لگے اور بدخواہ دلن نے کئی جھوٹ بولے، دیکھنے والے اداس ہوگئے، کہیں کہیں سے دبی دبی آہ بھی نکلی لیکن وہ لکیریں کھچی رہیں، ایک بھی نہ ہلی، ٹیڑھی ہونے لگیں، دوہری ہونے لگیں اور پھر سب کی سب کرسی میں ڈوب سی گئیں، پیچھے کو ٹکیں اور رونے کی گھٹی ہوئی دو چھوٹی چھوٹی آوازیں نکلیں ___ "اوہو، پتھر سے دل پھوٹ نکلا ہے" میں نے اپنے آپ سے کہا، پر اب تو کہانی بدلنے لگی تھی، یہ درد جواب اٹھا کہاں رینگ رہا تھا؟ لیکن عورتوں کے دل کا میں نے بھی پورا مطالعہ کیا تھا، کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی، عورتوں کے ایسا ہوتا ہی رہتا ہے اور اکٹھا ہوتا ہوتا جب ایک بار دوارا چھوتا ہے، تب ہی مرد کو پتہ لگتا ہے۔ کہانی آگے چلتی گئی، اور پھر ایک بار نئی مشکلیں ہیرو ہیروئن کا راستہ روکنے لگیں، ایک بار پھر لڑکی ہلنے لگی اور اس کی ساڑی کا پلو میرے دائیں ہاتھ پر آگرا، ظلم دیکھتے دیکھتے میں اپنی توجہ میں کسی چیز کا دخل

پسند نہیں کرتا، اور اب میں کسی کے گھرے ہوئے پلے بیٹھا چلوں تیرے پاس اس کیلئے وقت نہیں تھا۔ اپنے آپ کھینچ لے گی۔"
میں نے سوچا، ایسی بھی کیا بے ہوشی ہے جو پلے کا دھیان بھی نہیں ہے"

میں نے اپنا بایاں ہاتھ وہیں پڑے رہنے دیا، اور حیرت یہ کہ پلہ وہیں پڑا رہا ــــ اب یہ پلہ میری جان کی آفت ہو گیا، دل یہ بھی چاہتا تھا کہ پڑا رہے، الٹا اٹھ کے یہ سوال بھی میرے فلم کے مزے کو بگاڑ رہا تھا کہ یہ اٹھاتی کیوں نہیں۔ یوں تو مجھے اس سے کچھ تکلیف نہ تھی، اور ریشم کا یہ ٹکڑا بڑا نرم تھا کم بخت سینما کی ہوا میں ریشم سے بھی نرم ہو گیا تھا، بات ساری یہ تھی کہ یہ اپنے پلے کو کیوں نہیں اٹھاتی۔ ادھر فلم میں گھوڑے دوڑنے لگے، تلواریں چلنے لگیں، غل مچ گیا۔ اور مجھے یہ ذرا بھی پروا نہ رہی کہ اس لڑکی کا کیا ہو رہا ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ اسے بھی اس وقت کچھ نہ کچھ ہو رہا تھا میرا اپنا دل گھوڑوں کی ٹاپوں کے آگے آگے جا رہا تھا۔ اتنے میں دلہن نے ہیرو پر تلوار کا ہاتھ اٹھایا اور جیسے میرے دل پر گر آیا میں اچھل سا گیا، کیونکہ پلے کے ساتھ اب لڑکی کا ہاتھ بھی میرے اپنے ہاتھ پر گر سا گیا تھا۔ فلم کے گھوڑے، غل، غبار، تلواریں، کہانی کے کردار، خود کہانی، نہیں وہ سکرین وہ ہال بھی ایک دھوئیں میں کھو گئے اور دھوئیں میں سے وہی مدہم لکیریں پھوٹنے لگیں اور لکیروں کے بیچ رنگ بھر گئے گولائیاں آ گئیں، وہی رنگ وہی گولائیاں جنھیں میں ڈھونڈ رہا تھا، اور میں آنکھیں پھاڑتا ہوا دائیں طرف دیکھنے لگا، ہاتھ وہیں پڑا رہا اور میں اپنے دل کو تھامنے لگا۔ مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر اپنے جسم کا سارا بوجھ ڈالنا پڑا، کہ وہیں پڑا رہے، اور چھوں کی طرح چلے نہیں، بوٹیاں اندر اندر تو پھڑ پھڑانے لگیں، لیکن روشنی کی کمی کام آ گئی "ہو سکتا ہے کہ کوئی اور بات ہو" میں نے اپنے آپ کو سمجھایا، اس خیال کے آتے ہی دھواں چھٹ سا گیا اور پھر سے میں انہی لکیروں کو گھورنے لگا، روشنی اتنی ہی تھی جتنی پہلے، لکیریں ویسی ہی تھیں جیسے پہلے، تصور میں جو رنگ تھا اور گولائیاں بھر آئی تھیں، وہ بھی اب مٹ گئیں بات نئی یہ تھی کہ لڑکی اب سیدھی نہیں بیٹھی تھی، کرسی پر ایسی تھی جیسے ٹانگوں سے پکڑ کر کسی نے نیچے کھینچ دیا ہو، اب جو میں سیدھا اسی کے چہرے کو بدتمیزی سے دیکھنے لگا، معلوم ہوا کہ لڑکی اچھی خاصی ہے، چہرے پر جذبات کی اتنی چھاپ آ گئی ہے کہ روتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے اور اس کی آنکھیں بند ہیں

"باپ رے یہ معاملہ کیا ہے" میرا دل دھڑکنے لگا "معاملہ کیا ہے"؟ ــ وہی موقع ہے، وہی رحمت ہے جس کی تلاش تجھے تھی" میرا دل اچھل کر میرے ہاتھ میں آ گیا، جو اس نرم ہاتھ کے نیچے پھڑ پھڑانے لگا۔ ہاتھ نیچے سے اوپر آنا چاہتا تھا اور پھر میدان مارنا چاہتا تھا، کہہ رہا تھا کہ لڑکی موڈ میں آ گئی ہے ــ اسے سہارا دو ایسا موقع زندگی بھر نہ ملے گا۔

لیکن نہ جانے دل سے دور کونسی کوٹھری نے ایک ٹھنڈا بوجھ اچھال دیا، جو سیدھا اپنی دھڑکن پہ آ جا خیال محسوس تھا کہ یہ عورت بازاری ہو گی، یونہی ڈرامہ کر رہی ہے، اور نابالغ سمجھ کر چانس دے رہی ہے جسم پھر اس فیصلے

میں تن گیا کہ اس لمبی دیسی سے بچو، لیکن بچارا ہاتھ اندر اندر پھڑپھڑا تا رہا، باقی جسم نے تن کر بھی اجازت نہ دی کہ، بھی آزاد ہو کر ساڑھی کے پلے کو ادھر پھینک دے۔

اتنے میں یاد آیا کہ اپنے شہروں میں ایسے دیسے بازار اب کہاں، اب تو اپنے سماج ہیں ..... لیکن خیال پورا ہونے سے پہلے ہی لڑکی کا سر میرے کندھے سے لگ گیا جیسے اس کے ادھ کھلے بال میرے گال کے ساتھ لگ کر جیسے کہنے لگے اچھا جی تم نے ہم کو ایسا کہا۔"

گال کے ساتھ بال ایسے لگے رہے جیسے ان کی جانی پہچانی منزل تھی ـــــ ایسی دیسی لڑکی ہوتی تو انگریزی بال ہوتے، نہ ان میں فرانسیسی خوشبو ہوتی ۔

میں نے اپنا ہاتھ نکال ہی لیا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا ـــ رکھ دیا ـــ کچھ نہ ہوا۔ سہم سہم کے انگلیاں ملیں، کچھ نہ ہوا! پھر اٹھ کے میرے ہاتھ نے ہاتھ کو ملا کچھ نہ ہوا، اوپر بازو کی گولائی پر آیا ۔ دبایا، کچھ نہ ہوا، اور ہاتھ پر شکریہ کی تھپکی دیتے ہوئے دائیں طرف اتنا جھکایا کہ بائیں طرف دو خالی کرسیوں کے بعد تیسری پر بیٹھا ہوا آدمی بھی بیچ بیچ میں ادھر کی طرف دیکھنے لگا، میں بھی ڈر کے مارے بیچ میں سکرین کی طرف آنکھیں لگا کر دیکھنے لگا کہ اسے سمجھا دوں کہ بھائی ادھر کچھ نہیں ہو رہا ہے، کوئی خاص بات نہیں اور جب اس کو یقین نہ ہوا اور ساتھ بیٹھے آدمی کے ساتھ ۔ بھس بھس بھی کرنے لگا، میں نے اس کی پروا کرنی چھوڑ دی ـــــ "کیا کرے گا سالا جلتا ہے گا" میں نے سوچا اور یونہی اس کی طرف دیکھتا رہا، کندھے اور ہاتھ میں اپنا سارا احساس ڈال کر نئے امکانات کو سوچتا رہا، اب سکرین پر نہ جانے کیا ہو رہا تھا، میری سمجھ میں ایک بات بھی نہیں آ رہی تھی ـــ!

سر کا دباؤ میرے کندھے پہ بڑھتا گیا ۔ اور مجھے فکر ہونے لگی کہ یہ لڑکی بالکل لٹکنے لگی ہے اور ادھر وہ لوگ دیکھ رہے تھے، میں اپنے دائیں ہاتھ اور کندھے سے کتنی بھی ادٹ کرتا تب بھی یہ بات ایسی تھی تھوڑا دیکھ کر بھی لوگ بہت کچھ سمجھ جاتے، پکڑ اور دباؤ کی خاموش بولی میں جو کچھ کہا جا سکتا تھا میں نے کہہ دیا، لیکن اس کا بوجھ میرے کندھے پر بڑھتا ہی گیا اور مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے دھیرے سے اسے کہا، پھر کہا، سر ہلا کے کہا، لیکن اس کے ہاتھ پیر بھاری ہو گئے اور ایسا کہ جسم مجھ پر ڈالنا چاہتی ہے، اس پر میرا جی گھبراتا، کہتا کہ پھنس گیا ہوں، جانے کون ہے ۔ جانے کیا! کلنک لگائے گی اور شاید میں اسے ایک طرف دھکیل کر تیسری کرسی پر چلا جاتا، لیکن لڑکی بے ہوش پڑی تھی، آنسوؤں کی دو لکیریں دو گالوں پر چمک رہی تھیں، ہاتھ پسینے میں ڈوب رہا تھا، اور وقت تھا کہ سہارا دوں اسے پچکاروں، حوصلہ بڑھاؤں اور سمجھاؤں کہ آخر میں بھی تو انسان ہوں، میرا بھی تو دل ہے اور جذبات میں ڈوب جانے کی کیا یہی ایک جگہ ہے؟ کیا ہوا جو ہماری یہ پہلی ملاقات ہے، کیا ہوا جو ماحول اتنا دلچسپ ہے۔

لیکن اسی وقت بجلی ٹوٹ کر گری۔ اس شعلہ کی روشنی میں بھی لڑکی ہلی نہیں بس چھاتی اور کندھے پر پڑی رہی
پاس کے آدمی کھڑے ہو گئے، گھبراہٹ میں جیسے آپ گرنے لگا تھا، میں نے اسے دھکا دیا۔ دھکا کھا کر بھی وہ مجھ پہ
پہ گرنے لگی تھی، میں ہٹا اور وہ منہ کے بل دو کرسیوں پہ گر گئی۔ سینما ہال میں شور پڑا، چاروں طرف سے لوگ آ گئے اور
لڑکی کو سیدھا اٹھایا گیا۔

پھر مجھے ایسا لگا کہ ہال بھر کی روشنی اسی پر مرکوز ہو گئی ہے۔ اور بھیڑ ہوتی کوئی اسے چھونا نہیں چاہتا۔ گری ہوئی لڑکی
کو سیدھا اٹھانے والے تو بہت آ گئے تھے، لیکن اب سیدھی پڑی لڑکی کے منہ پر جھاگ تھی، اور جسم پہ مرگی کا دورہ مدغم
ہو چکا تھا!

ہال بھر کی وہ روشنی پھر جیسے اسی جھاگ پر اکٹھی ہو گئی اور ایک چلو میں بھک اٹھی، وہیں دیکھتے دیکھتے، کھڑے کھڑے
مجھے ایک نیا گھونٹ پینا پڑا۔

غزل

گوپال متل

جو شعلۂ لب ہے موجِ نو بہارِ نغمہ ہے
خامشی بھی آپ کی آئینہ دارِ نغمہ ہے

گوش اک مدت سے محرومِ سماعت ہے مگر
دل عجب ناداں ہے اب تک اعتبارِ نغمہ ہے

فرق یہ ہے نطق کے سانچے میں ڈھل سکتا نہیں
ورنہ جو آنسو ہے دُرِّ تابدارِ نغمہ ہے

منکرِ سازِ مسرت ہوں تو کافر ہوں مگر
ہمنشیں! مضرابِ غم پر انحصارِ نغمہ ہے

اے کہ شکوہ تھا تجھے سنگیں مزاجی کا مری!
دیکھ! اس پتھر میں بھی موجِ شرارِ نغمہ ہے

بشیر بدر

غزل

جتنا خلوص اس نگہِ عشوہ گر میں ہے
میری نظر میں ہے نہ تمہاری نظر میں ہے

ہر بات انتظار ہے، ہر ظن امید ہے
انساں اسیرِ وعدۂ شام و سحر میں ہے

ہم منزلِ حیات کی کیا جستجو کریں؟
خود منزلِ حیات ابھی رہگذر میں ہے

مانگی تھی صبحِ زیست ملی شامِ زندگی
کیسا اثر ہماری دعائے سحر میں ہے

تیری بھی یاد بیٹھ گئی مثلِ گردِ راہ
تنہا مسافرِ شبِ غم اب سفر میں ہے

دل تو اسیرِ گیسوئے لیلائے شب ہوا
جاں اپنی گردِ راہِ نگارِ سحر میں ہے

آبِ رواں سے عہدِ وفا اک فریب ہے
لو، آخری سلام مسافر سفر میں ہے

یہ چلمنوں کی چاندنی دیوارِ رنگ و بو
وہ چاند جلوہ بار انھیں بام و در میں ہے

وہ بدر جس کو بدرِ سخن خود سخن کہے
دیکھا تو مثلِ خاک تری رہگذر میں ہے

ساقی فاروقی

ہماری تباہی میں کچھ اِس کا احساں بھی ہے
جو دردِ اِن دنوں وجہِ آرائشِ جاں بھی ہے

یہی فصل کلیاں جھلستی ہیں جس فصل میں
سنا ہے نیا نام اس کا بہاراں بھی ہے

بکھر گیا ہے لہو ان کے اعزاز میں
بہاروں میں خوشبوئے خونِ شہیداں بھی ہے

ان آنکھوں کی تقدیر اب اشک ریزی ہوئی
اور اشکوں کی تقدیر میں رنگِ مرجاں بھی ہے

اگر رات کٹ جائے تو خوش نصیبی کہو
فضاؤں میں اندیشۂ بادو باراں بھی ہے

شہریار

غزل

متاعِ عمر ہی کیا جاتی رائیگاں یوں بھی
ادا ہوا نہ مگر قرضِ دوستاں یوں بھی

ضرور کیا تھا کہ تم بھی کرو کرم سے گریز
ہمیں تو یاد تھی بے مہریٔ جہاں یوں بھی

بہانہ مل گیا دل کو ترے تغافل کا
وگرنہ اس کو تو ہونا تھا بدگماں یوں بھی

زبانِ غیر کو دیتے ہیں درسِ طرزِ سخن
ستم نصیب کیا کرتے ہیں فغاں یوں بھی

اکیلے اشعار

محبوب خزاں

اے دل کوئی تجھ سا بھی ستمگر نہیں دیکھا
جلووں کو شکایت ہے پلٹ کر نہیں دیکھا

اب ان آنکھوں میں جلوے ٹھہرتے نہیں
ایسے لمحے بھی ہیں جو گزرتے نہیں

گھبرا کے نہ دیکھ فاصلوں کو
تیری ہی ادا کے پیچ و خم ہیں

کچھ لوگ جی رہے ہیں شرافت کو بیچ کو
تھوڑی بہت انہیں سے شرافت خریدیے

دل لے کر اب جائیں کہاں
دنیا چھوڑی دل کے لئے

اتنا گناہ ہے مرا اے شمع انتظار!
کرتا ہوں انتظار سحر بھی، کبھی کبھی

اس ڈھنگ سے نہیں کیا، زندگی ہماری ہے

اسی طرح سے گزر جائے گی، گزاری ہے

("اکیلی بستیاں" کے اکیلے اشعار)

راج نرائن راز

غزل

جل رہا ہے دماغ کیا کیجے
دن میں روشن چراغ، کیا کیجے

شبنمیں آنکھ، ہونٹ خنداں سے
اتنے مبہم سراغ کیا کیجے

چاندنی، پھول، جام، بربط، تم
دل کا اک ایک داغ کیا کیجے

مسکراہٹ، چمک نہ خوشبو ہی
آرزوؤں کے باغ! کیا کیجے

رازؔ بے طرح ہونٹ جلتے ہیں
زندگی کے ایاغ! کیا کیجے

مظہر امام

غزل

عشق کی قاہری بھی دیکھی ہے
حسن کی بندگی بھی دیکھی ہے

موجزن جس میں خشک آنسو ہوں
میں نے ایسی ہنسی بھی دیکھی ہے

عشق کو بے نیاز پایا ہے
حسن کی بے بسی بھی دیکھی ہے

جگمگاتے ہوئے خیالوں کی
اونگھتی تیرگی بھی دیکھی ہے

پاکیٔ گفتگو کے پردے میں
ذہن کی گندگی بھی دیکھی ہے

جس پہ احباب کا خلوص نثار
ہم نے وہ دشمنی بھی دیکھی ہے

گفتگو کا سکوت دیکھا ہے
بولتی خامشی بھی دیکھی ہے

جرم ہے جس کو زندگی کہنا
میں نے وہ زندگی بھی دیکھی ہے

اختر ہوشیار پوری

غزل

شاخوں پہ زخم ہیں کہ شگوفے کھلے ہوئے
اب کے فروغِ گل کے عجب سلسلے ہوئے

خورشید کا جمال کسے ہو سکا نصیب
تاروں کے ڈوبتے ہی رواں قافلے ہوئے

اپنا ہی دھیان اور کہیں تھا نظر کہیں
ورنہ تھے راہ میں گل و غنچہ کھلے ہوئے

تم مطمئن رہو کہ نہ دیکھیں نہ کچھ کہیں
آنکھوں کے ساتھ ساتھ ہیں لب بھی سلے ہوئے

مانا کسی کا دردِ غمِ زندگی نہیں!!!
پھر بھی کسے کے درد سے کیا کیا گلے ہوئے

جو سانس آگے مس ہوئے وہ منزلیں تھیں
لمحے جو ہم پہ بیت گئے فاصلے ہوئے

اختر مجھے یہ ڈر ہے کہ دامن نہ جل اٹھے
پاتا ہوں آنسوؤں میں شرارے ملے ہوئے

خلیل رامپوری

غزل

یاد کی کلی چٹکی، غم کا گلستاں مہکا
چاند کے تبسم میں جانے رات کیا دیکھا

ہم بھی رنگِ دنیا سے کر رہے ہیں اندازہ
آدمی ستاروں کی مشعلیں بجھائے گا

گوشۂ تخیل میں شہر ہے نہ ویرانہ
کس اداس عالم میں تجھ کو خواب میں دیکھا

اک چراغ بجھتا ہے، سو چراغ جلتے ہیں
دن کے نور سے اپنی رات کا سماں اچھا

فاصلے جدائی کے عمر بھر نہ کم ہونگے
عشق، نکہتِ برباد، حسن، برگِ آوارہ

محمود ایاز

غزل

دن کو کارِ درازِ دہر رہا
رات خوابوں کی وادیوں میں کٹی

چاند خاموش جا رہا تھا کہیں
ہم نے بھی اس سے کوئی بات نہ کی

برگِ آوارہ سے کوئی پوچھے
بوئے گل کس کی جستجو میں گئی

ساعتِ دید! تیری عمر ہی کیا
ابھی آئی نہ تھی کہ بیت گئی

یوں نہ کٹتی شبِ حیات مگر
اپنے اشکوں کی روشنی میں کٹی

درودیوار کی خموشی نے
رات بھر ہم سے کوئی بات کہی

کس کا نغمہ ہے دل کی دھڑکن میں
کس کی آوازِ پا سکوت بنی

سٹیفن زویگ

لے پوریلا

کرسنشیا انا ایبوسیا فنکن سیبو، انتالیس برس کی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اسبرک کے پہاڑی علاقہ کی ایک خستہ جھونپڑی میں اس کا جنم ہوا تھا (ماں باپ کی شادی سے پہلے) سرکاری رجسٹروں میں اس کا حلیہ اس طرح درج تھا ــــ پیشہ: نوکرانی، چہرے مہرے سے تھکے ماندے خچر سی دکھائی دیتی ہے۔ سچ مچ، اس بیچاری کا نچلا ہونٹ خچر کی طرح لٹکا ہوا تھا ــ لمبا، نوکیلا چہرا اور بغیر پلکوں کی آنکھیں علاوہ کھردرے بال سبھی خچروں جیسے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی چال بھی اڑیل ٹٹو کی طرح تھی، جیسے ٹٹو کو سردی ہو چاہے گرمی ہر موسم میں بوجھ ڈھونا پڑتا ہے، ایسے ہی کرسنشیا دن بھر کام کرنے سے تھک کر چور ہو جاتی اور بیٹھی بیٹھی سو جاتی جیسے اصطبل میں بندھے خچر کھڑے کھڑے سو جاتے ہیں۔ اس کی زندگی پتھر کی طرح بے حس، سنگین اور بوجھل تھی، سوچنا اس کے لئے انتہائی مشکل کام تھا۔ اس کی ذہنی چھلنی کے سوراخ ہمیشہ بند رہتے تھے، لیکن اگر ایک بار کوئی خیال اس میں سے چھننے میں کامیاب ہو جائے تو وہ ہمیشہ کیلئے اس کے ذہنی تہ خانے میں محفوظ ہو جاتا اس نے کبھی کتاب اور اخبار نہیں پڑھا تھا۔ اس کی تحریر اس کے وجود کی طرح بھونڈی اور بدصورت تھی، اس میں عورتوں جیسی کوئی بات نہ تھی اس کی آواز اس کے سر، ٹخنوں اور کولہوں کی طرح سخت اور گمبھیر تھی، ٹائرول کی باشندہ ہوتے ہوئے بھی اس کی آواز زنگ خوردہ پھاٹک کی طرح چیختی ہوئی تھی۔ یہ سب فطری تھا وہ کبھی فالتو بات نہیں کرتی تھی۔ کبھی کسی نے اسے ہنسی مذاق کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس ڈھنگ سے وہ گھٹیا جانوروں سے بھی گئی گزری تھی۔ کیونکہ عمومی طور جانور اپنے فطری جذبات کو اپنے فطری ڈھنگ سے ظاہر کرتے ہیں۔

ناجائز اولاد ہونے سے اس کی پرورش یتیم خانے میں ہوئی۔ بارہ برس کی عمر میں اسے ایک ریستوران میں نوکری کرنی پڑی۔ اپنی محنت اور ایمانداری سے آہستہ آہستہ وہ ایک ہوٹل کی باورچن بن گئی۔ روز علی الصبح وہ پانچ بجے اٹھتی۔ ریستوران کے سارے کمروں اور ان کے فرش کو خوب رگڑ رگڑ کر صاف کرتی، کمروں میں آتشدان سلگاتی

پھر کھانا تیار کرتی کپڑے دھوتی اور ان کو پریس کرتی۔ عنقریب آدھی رات کو جاکر وہ کہیں نہ سستاتی۔ اس نے کبھی ہوٹل کے مالک سے ایک روز کی چھٹی نہیں مانگی تھی۔ گرجے کے سوا وہ کہیں نہ جاتی تھی

لئے مردوں میں کبھی دلچسپی ہوئی۔ شاید پچیس سال مشین کی طرح کام کرتے ہوئے جیسے وہ بے حس مشین بن کر رہ گئی تھی۔ اس لئے اس میں جو رہی سہی دلکشی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اس کو محبت جیسے جذبے سے سخت نفرت تھی۔ اسے راحت ملتی تھی صرف پیسہ جمع کرنے میں۔ اس معاملے میں وہ پوری گنوار تھی۔ اسے ڈر تھا کہ بڑھاپے میں اسے کسی کا غلام بن کر نہ رہنا پڑے۔ کسی سے مانگ کر کھانے کی نسبت وہ مر جانا زیادہ بہتر سمجھتی تھی۔

اس کفایت شعاری کی بدولت یہ پھوہڑ عورت اپنا آبائی وطن چھوڑ کر دوسرے صوبے میں چلی آئی۔ کسی ایمپلائمنٹ ایجنسی کی منیجر گرمی کی چھٹیاں گزارنے کے لئے روول آئی تھیں۔ کرسنشیا کی جی توڑ محنت سے وہ دنگ رہ گئیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ وی انا جاکر دگنے پیسے کما سکتی ہے۔ سن کر وہ فوراً راضی ہو گئی

وہ اپنی بید کی ٹوکری گھٹنوں پر رکھے ریل میں سفر کر رہی تھی۔ اس ٹوکری میں اس کے زندگی بھر کا اثاثہ تھا۔ ڈبے میں بیٹھے مسافروں نے کرسنشیا سے احتراماً کہا۔

"محترمہ! آپ تھک گئی ہوں گی لائیے ٹوکری کو سامان کی سیٹ پر رکھ دیں"

لیکن اس پھوہڑ عورت نے صاف انکار کر دیا۔ وہ سب شہریوں کو چور اور بدمعاش سمجھتی تھی۔

وی انا آکر کچھ روز تو باہر اکیلی جانے سے ڈرتی رہی۔ اس نے سڑکوں پر اتنی بھیڑ کبھی نہ دیکھی تھی۔ ایک بار راستے سے اچھی طرح واقف ہونے پر وہ اکیلی سبزی سے بھری ٹوکری اٹھا کر گھر آجاتی۔ وی انا میں اسے جھاڑو دینے، فرش دھونے اور کمرے گرم کرنے کا کام کرنا پڑا۔ رات کو وہ حیوانوں کی طرح منہ کھول کر خراٹے بھرتی تھی۔ اس نے اس بارے میں شاید کبھی نہ سوچا تھا۔ وہ اس طرح جی جان سے محنت کرتی سب احکام کا جواب صرف ہاں میں ذرا کندھے جھٹکا کر دیتی تھی۔ گھر میں دوسری نوکرانیوں سے اس کا کوئی میل جول نہیں تھا۔ وہ ان کی چھیڑ چھاڑ کا کوئی جواب نہ دیتی تھی۔ ایک بار ایک نوکرانی نے اس کے گنوار تلفظ کی نقل اتاری تو وہ چولہے میں سے جلتی ہوئی لکڑی لے کر اس کے پیچھے بھاگی تھی

اس دن کے بعد کسی کو اسے چھیڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ہر اتوار صبح کو کرسنشیا اپنا بھاری بھرکم گاؤن اور سایہ پہن کر گرجے جاتی تھی۔ ایک بار چھٹی کے دن وہ وی انا کی سیر کو نکلی۔ کفایت کی وجہ سے وہ ٹرام پر چڑھنے کی بجائے پیدل چل نکلی۔ ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد وہ دریائے ڈینیوب کے کنارے پہنچ گئی۔ کچھ دیر دریا کو دیکھنے کے بعد وہ لوٹ آئی۔ وہ سیر یقیناً اسے پسند نہیں

آتی تھی کیونکہ اس روز کے بعد وہ کبھی سیر کو نہ گئی تھی اتوار کے روز وہ سینے پرونے کا کام کرتی یا پھر کوٹھری کی کھڑکی میں سے سارا وقت باہر جھانکتی رہتی۔ بڑی اماں کی اس کی رفتار زندگی ویسی ہی تھی۔ فرق اگر پڑا تو صرف اتنا کہ ہر ماہ اب دو کی بجائے چار نیلے نوٹ اسے تنخواہ میں ملتے تھے، وہ ان نوٹوں کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد ان کی سلوٹیں دور کرتی تھی اور پھر انھیں پیلی لکڑی کی صندوقچی میں رکھ دیتی تھی جسے وہ گاؤں سے اپنے ساتھ لائی تھی اس پرانی صندوقچی میں اس کی حیات کا اثاثی مقصد چھپا تھا، رات کو وہ صندوقچی کی چابی اپنے سرہانے چھپا کر سوتی، دن میں چابی کہاں رہتی تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

وہ اس قسم کی عورت تھی (انسانی فطرت سے مبرا ہوتے ہوئے بھی آخر وہ ایک عورت تھی) شاید کوئی دوسری عورت نوجوان بیرن وان لیڈرشیم کے عجیب گھر میں اتنے دنوں تک ٹھہر سکتی تھی، کیونکہ مالکہ کا مزاج بڑا ترش اور جھگڑالو تھا، وہ نیم پاگل ہو کر نوکر اور نوکرانیوں کو گالیاں دیتی تھی اس سے تنگ آ کر نوکر وغیرہ بھاگ جاتے تھے۔ بیرونس ایک امیر کارخانہ دار کی بیٹی تھی۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود ابھی وہ کنواری تھی۔ اچانک ایک روز بہار پر اس کی بیرن سے ملاقات ہوئی وہ عمر میں اس سے کئی سال چھوٹا تھا۔ اس وقت وہ گلے تک قرض میں ڈوبا ہوا تھا۔ فطرتاً وہ خوبصورت اور بداخلاق تھا۔ وہ دولت کے لالچ میں اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ لڑکی کے والدین کسی امیر داماد کی تلاش میں تھے، لیکن بیٹی نے ان کی صلاح کے بنا ہی شادی کر لی

شادی کے ایک ماہ بعد ہی بیرنس نے اپنی قسمت کو کوسنا شروع کر دیا، بیرن شادی کے بعد بھی اپنی بیوی کے علاوہ دوسری عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا، اس کا قرضہ دن بدن بڑھ رہا تھا، وہ تمام بدچلن آدمیوں کی طرح ہنس مکھ اور بے اصولا تھا، وہ اپنے اخراج پر پابندی لگانا کمینہ پن سمجھتا تھا۔ شادی کے بعد بھی وہ کھلے بندوں دولت لٹاتا رہا۔

بیرنس اپنے گھر کو سگھڑ طریقے سے سنبھال کر چلانا چاہتی تھی جیسا کہ اس نے اپنے میکے میں دیکھا تھا مگر بیرن کو یہ بنیا پن سخت ناگوار گزرتا تھا، جب بیرنس نے خاندان کے ریس کے گھوڑوں کا اصطبل بنانے کی سکیم کی مخالفت کی تو بیرن نے اس گھٹیا پن کیلئے بیرنس کے تئیں ذرا سختی برتنی شروع کر دی۔ مگر بڑے آرام اور اخلاق سے، اس کے اس رویے سے بیرنس گھبرا اٹھی، وہ بیرن کو طعنے دینے لگی، وہ آرام سے بیٹھا سنا کرتا۔ اس کے طعنے ختم ہوتے تو وہ سگریٹ سلگا کر باہر نکل جاتا۔ اس گونگی بے رحمی نے بیرنس کو اچانک پاگل بنا دیا تھا۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نوکروں پر نکالتی، پچھلے دو برسوں میں بیرنس نے

سولہ نوکر بدلے تھے ایکبار تو ایک نوکر کو زخمی کرنے کے الزام میں اسے بھاری رقم دینا پڑی تھی اسے اپنی بدنامی کا ڈر تھا

صرف کرسنشیا ہی ایک ایسی نوکرانی تھی جس پر گالی گلوچ کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، وہ مالکن کے سامنے اس طرح کھڑی رہتی جیسے برسوں سے ٹھوکھڑا رہتا ہے۔ وہ خاوند بیوی کے جھگڑے میں کبھی دلچسپی لیتی تھی نوکروں کے آنے جانے سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ اپنا خالی وقت اپنی کوٹھری میں گزارتی تھی، بیرنس کی بکواس، ہسٹریا کے دوروں اور پاگل پن سے وہ ذرا بھی بیزار نہ ہوتی تھی۔ دراصل اسے بازار جانے آنے اور رسوئی کے کاموں سے فرصت ہی کم ملتی تھی اس کا دل پتھر کی طرح سخت اور بے حس تھا۔ دو برس وی انا میں رہکر بھی اس کی عادات ویسی کی ویسی ہی تھیں، اس میں شک نہیں کہ اس کی صندوقچی میں نوٹوں کی ڈھیری ایک انچ اور بڑھ گئی تھی دو سال بعد جب اس نے ہاتھوں کو تھوک لگا کر نوٹوں کو گنا تو اسے اپنے خواب کی تعبیر پوری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی ——— پورے ایک ہزار ———

لیکن قسمت سنگین سے سنگین چٹان میں بھی سوراخ کر دیتی ہے۔ کرسنشیا کے ساتھ بھی ایک ایسا ہی مذاق ہوا۔ ان دنوں سرکاری مردم شماری ہو رہی تھی، چونکہ بیرنس کے تمام نوکر نوکرانیاں ان پڑھ تھے اس لئے بیرن نے خود سرکاری کاغذات کی خانہ پوری کا فیصلہ کیا تب کرسنشیا کو بھی اسٹڈی روم میں بلایا گیا۔ بیرن نے اس کا پورا نام، عمر اور جائے پیدائش پوچھی۔ جب بیرن کو معلوم ہوا کہ وہ ٹائے رول کی رہنے والی ہے تو اس نے اس سے تفصیلی بات چیت شروع کر دی وہ ایکبار شکار کرنے ٹائے رول گیا تھا اس کے ساتھ فکن سیو بزنام کا ایک گائیڈ بھی تھا جو کرسنشیا کا چچا تھا، بیرن کی اس گائیڈ سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی گفتگو کے دوران اس نے بتایا کہ ایکبار وہ اس سرائے میں ٹھہرا تھا، جہاں کرسنشیا پہلے کام کرتی تھی، اس سرائے میں جیسا ہرن کا گوشت پکا تھا ویسا اسے بعد میں نصیب نہیں ہوا۔ یہ باتیں بظاہر بڑی معمولی تھیں مگر افسوس کہ قسمت کی لمبی باتیں، انھیں معمولی باتوں کو ایک کڑی میں جوڑ کر غیر معمولی بنا دیتی ہیں۔ کرسنشیا اپنے آبائی وطن سے واقف آدمی کو دیکھکر بڑی خوش ہوی، مسرت سے اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ وہ احترام سے اس کے سامنے بار بار سر جھکانے لگی۔ بیرن ایکدم مذاق پر اتر آیا اور اسے دیہاتی لب لہجہ میں چھیڑنے لگا۔ اس کے سخت کولہوں کو تھپتھپا کر اس نے کہا،

"جاؤ میری اچھی سنہری! مجھے بہت کام کرنا ہے مگر اپنے ساتھ یہ دو سکے لیتی جاؤ کیونکہ تم ٹائے رول کی رہنے والی ہو ——— !"

وہ اس مہربانی سے جیسے ٹکی بکی رہ گئی

بیرن نے یہ سب باتیں کسی خاص جذبے سے متاثر ہو کر نہیں کہی تھیں جو شعوری طور پر کرسنتیا کے جسم میں کھلبلی مچا دیتیں اس کے الفاظ کے ننھے کنکروں نے اس کی زندگی کے پرسکون تالاب میں ڈوب کر اس کی روح کو مرتعش کر دیا تھا۔ وہ آدمی اس کے آبائی وطن کے چپے چپے سے واقف تھا یہاں تک کہ اس نے کرسنتیا کے ہاتھ سے پکا ہرن کا گوشت بھی کھایا تھا ـــــــــــ بعد پھٹپھاہٹ کا وہ معصوم زلزلہ جس نے اس کی سوئی ہوئی ادھیڑ عورتیت کو جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا وہی زبان میں اسے عشقیہ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ کرسنتیا کبھی خواب میں بھی یہ سوچنے کی ہمت نہ کر سکتی تھی کہ کوئی خوبصورت اور قابل احترام شخص اس کے ادھیڑ اور خشک جسم کی امید کر سکتا ہے۔ اس وقتی لمس نے اس کے انگ انگ میں جیسے طوفان کی آگ سلگا دی تھی۔

اس واقعہ نے اس کی شخصیت میں ایک پراسرار اور نامعلوم سی تبدیلی لادی جس طرح مالک کا وفادار کتا ہزاروں آدمیوں میں سے اپنے مالک کو پہچان لیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کرسنتیا بیرن کے تئیں احترام سے بھر گئی۔ جیسے وفادار کتا سائے کی طرح مالک کے ساتھ رہتا ہے، اس سے ذرا سا پیار پانے کے لیے گھنٹوں دم ہلاتا رہتا ہے۔ غلاموں کی طرح وہ مالک کے ہر حکم کو پورا کرتا ہے اس کے قلب کے باریک خانے میں جہاں ابھی تک صرف نصف درجن الفاظ ہی موجود تھے ـــــ مثلاً پیسہ، بازار، رسوئی گرجا، ستر، وغیرہ اچانک ایک نیا خیال پلنے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ گزشتہ تمام بادوں کو نکال باہر کر وہ خیال سیدھا اس کے دل کی تہ میں جا بیٹھا، کرسنتیا کا اجڈ من کسی صورت کو اتنی جلدی آسرا دینے کے لیے تیار نہ تھا، اس لیے کچھ دن تو اس نے اس نئے خیال کو سر اٹھانے نہ دیا، مگر بالآخر جلد ہی اس کے اندر تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے، مثال کے طور پر اب وہ بیرن کے کپڑوں اور جوتوں پر بڑی محنت سے برش پھیرنے لگی، بیرن کے قدموں کی آہٹ سنتے ہی وہ دوڑی ہوئی ہال میں آتی اور اس کا ہیٹ، کوٹ اور چھڑی کھونٹی پر ٹانگ دیتی۔ رسوئی گھر میں وہ پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگی علاوہ ازیں ہرن کے گوشت کی تلاش میں وہ پوچھتی ہوئی بڑے بازار تک پہنچ جاتی۔ زندگی میں پہلی بار اس کا دھیان اپنے کپڑوں اور جسم کی صفائی کی طرف گیا تھا۔

دو ہفتے بعد اس ننھے معصوم خیال کے پودے سے پیاری پیاری کونپلیں پھوٹ نکلیں۔ کچھ دیر بعد ان میں سوندھی سوندھی خوشبو اور رنگت کا بھینا سنہری رنگ مسکرانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرسنتیا کو

بیرنس سے سخت نفرت ہوگئی، وہ بیرن کی بیوی ہوتے ہوئے بھی اس کی عزت نہیں کرتی تھی۔ ایکبار جھگڑے کے دوران بیرنس نے خاوند کے خلاف بڑے گندے اور نامناسب الفاظ استعمال کئے مگر وہ ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوا کرسنتیا بیرن کو خاموش بیٹھا دیکھکر بڑی متاثر ہوئی، اسے بیرنس سے اور نفرت ہوگئی اسے بلانے کے لئے بیرنس کو کئی بار گھنٹی بجانی پڑتی بالآخر کرسنتیا مالکن کے سامنے جاکر اڑیل ٹٹو کی طرح جم کر کھڑی ہو جاتی، چپ چاپ اس کے حکم کا انتظار کرتی رہتی۔ بیرنس اس کی خاموشی سے جلکر پوچھتی

"تم نے میری بات سنی یا نہیں —؟"

"ہاں ہاں سن لی —!" کرسنتیا اجڈ طریقے سے جواب دیتی۔

جب بیرنس تھیٹر جانے کی تیاری کرتی تو کرسنتیا جان بوجھ کر اس کے زیورات کی دراز کی چابی کہیں ادھر ادھر رکھ دیتی۔ اگر بیرنس کو کوئی ٹیلیفون کرتا تو وہ کبھی اس کی اطلاع بیرنس تک نہ پہنچاتی تھی۔ جھاڑنے پر وہ سنجیدہ لہجے میں کہتی "میں بھول گئی تھی —" اس نے کبھی مالکن کی طرف سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے خوف تھا کہ اس کی دبی نفرت کہیں وہ اس کی آنکھوں میں نہ پڑھ لیں

اس کی اس ڈھکی چھپی نفرت سے بیرنس کا پاگل پن اور بھی بڑھ گیا۔ اتنے سال کنوارا رہنے کے کارن، بیرنس کا مزاج بہت چڑچڑا اور تلخ ہو گیا تھا۔ اس کی ساری کسر وہ نوکروں پر نکالتی تھی، رات کو سونے سے پہلے وہ دوائیاں کھاتی تھی اس سے اس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی تھی، سارے گھر میں اس سے ہمدردی کرنے والا کوئی نہ تھا، کوئی اسے صبر، ضبط اور صحت مند زندگی کی راہ دکھانے والا نہ تھا ایک ماہر نفسیات نے اسے کسی سینی ٹوریم میں دو ماہ جاکر آرام کرنے کی صلاح دی۔ بیرن نے جب سنا تو اس نے اس تجویز کی زور شور سے حمایت کی مگر بیرنس نے انکار کر دیا آخر کار کافی سمجھانے بجھانے پر وہ راضی ہو گئی اور اس نے اپنی خاص نوکرانی کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا

کرسنتیا نے جب سنا کہ بیرن مکان میں اکیلا رہے گا تو اسے جیسے کوئی انمول خزانہ مل گیا، اس کا پھوہڑ پن فور ہو گیا اور وہ ایکدم حساس بن گئی، جب بیرنس جانے لگی تو اس نے پھرتی سے بیرنس کا سامان اکٹھا کیا اور قلی کی طرح بڑے بڑے صندوق اپنے کندھوں پر اٹھا کر ٹیکسی تک پہنچا آئی اور رات کو جب بیرن بیوی کو گاڑی میں چڑھا کر لوٹا تو اس نے کرسنتیا کے ہاتھوں میں اپنا ہیٹ اور اوورکوٹ تھماتے ہوئے راحت کا سانس لیا

"شکر ہے کچھ دنوں کے لئے اس مصیبت سے جان چھوٹی —!"

جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں، کرسٹنیا ہمیشہ جانوروں کی طرح خاموش رہتی تھی۔ مگر آج یہ سن کر اس کے ہونٹ ایک عجیب و غریب مسکراہٹ سے پھڑک اٹھے۔ بیرن کو فوراً خیال آیا کہ ایک گھٹیا نوکرانی کے سامنے اس نے اتنی بے تکلفی سے کیوں بات کی۔ وہ چپ چاپ اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ لیکن بیرن کا یہ تکلف وقتی تھا۔ دوسرے ہی روز وہ کرسٹنیا کے ساتھ بے تکلف بننے کا عادی ہو گیا۔ بیرونس کے جاتے ہی گھر کا ماحول بالکل چپ ہو گیا بیرن کو اب وہاں ٹوکنے اور جواب طلب کرنے والا کوئی نہ تھا۔ رات کو جب دیر سے لوٹتا تو کرسٹنیا بڑے احترام سے اس کا سواگت کرتی۔ آجکل وہ پہلے سے بھی زیادہ چست ہو گئی تھی۔ وہ علی الصبح اٹھ کر بیرن کے کمرے کے فرنیچر کو خوب اچھی صاف کرتی، لذیذ کھانے تیار کرتی اور بیرن کو اس نئے ڈنر سیٹ میں کھانا کھلاتی جو صرف خاص موقعوں پر ہی باہر نکالا جاتا تھا۔ حساس بیرن نوکرانی کی اس خدمت گزاری کو دیکھ کر اپنی شفقت کا اظہار کئے بنا نہ رہ سکا۔ اس نے کھل کر کرسٹنیا کے بنائے ہوئے کھانے کی تعریف کی۔ دو دن بعد بیرن کی سالگرہ کے موقع پر کرسٹنیا نے بڑی محنت سے ایک کیک تیار کیا اور اس پر بڑے خوبصورت حروف میں بیرن کا نام بنایا۔ بیرن نے دیکھا تو مسکرا کر کہا

"کرسٹنی! تم میری عادات بگاڑ رہی ہو جب بیرونس لوٹے گی تو مجھے کون اتنی اچھی چیزیں کھلائے گا"

جو لوگ جاگیردارانہ نظام سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جنگ سے پیشتر آسٹریا کے زمیندار اپنے نوکروں سے کتنا کھلا برتاؤ کرتے تھے۔ دراصل اس برتاؤ میں شفقت کی نسبت اونچی طبقاتی بو زیادہ تھی وہ اپنا مقام بچاتے تھے اس لئے ان کی زبان کی لگامیں کچھ ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ گیلیشیا کا ڈیوک اپنے اردلی کو بھیج کر چکلے سے کسی رنڈی کو بلواتا تھا تو اپنی تسکین کے بعد اسے اردلی کو سونپ دیتا تھا۔ امیر اور قابل عزت لوگوں کو لوک سرح چھوت کی سی لگی تھی۔ وہ سنجیدہ لکھے پڑھے سنجیدہ لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کی بجائے اپنے نوکروں کی صحبت میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مالک نوکروں کو برابری کا درجہ دیتے تھے۔ مالک مالک تھے اور نوکر نوکر۔۔۔ اسی طرح بیرن کو ایک گنوار عورت کے سامنے اپنی بیوی کی برائی کرنے میں زیادہ تکلف نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ پھوہڑ نوکرانی اسے دھوکہ نہیں دے گی۔ لیکن اس کے خیالات کا اس بیچاری کے سیدھے سادے دل پر کیا اثر پڑا، اسے پتہ نہ تھا

کچھ روز تو بیرن نے اپنی عادتوں پر ضبط کا پردہ ڈالے رکھا لیکن کرسٹنیا کا اعتماد پا کر اس نے گھر میں ہی بدمعاشی شروع کر دی۔ ایک دن شام کو کرسٹنیا کو اس نے ٹیلی فون کیا اور کہا کہ وہ رات کو دیر سے لوٹے گا، اسے دو آدمیوں کا کھانا تیار رکھنا چاہئے۔

"جو حکم سرکار—!" کرسنشیا نے جواب دیا۔ بیرن اسے بالکل بیوقوف سمجھتا تھا۔ لیکن آدھی رات گئے جب وہ اوپرا کی ایک رقاصہ کے ساتھ گھر لوٹا تو اس نے دیکھا کہ کھانے کی میز پہ پھولوں کے گلدستے سجے ہیں اور سونے کے کمرے میں دو کی بجائے ایک پلنگ بچھا ہے، کھونٹی پر اس کی بیوی کا گاؤن لٹکا تھا اور پلنگ کے پاس ایک جوڑی سلیپروں کی رکھی تھی۔ بیرن کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی تب وہ کرسنشیا کو قابلِ یقین سمجھنے لگا۔

اگلے روز صبح اس نے گھنٹی بجا کر نوکرانی کو اپنے کمرے میں ناشتے کیلئے بلایا تو اس وقت کرسنشیا کے نئے نام کی اختراع ہوئی۔ بیرن کی نئی محبوبہ بیرن کو پیار سے "ڈان ژوان"[1] کہہ کر پکارتی تھی۔ دوسری بار جب وہ بیرن کے ساتھ آئی تو اس نے بیرن سے مذاق کرتے ہوئے کہا:

"ڈان ژوان! ذرا اپنی ہے پوریلا کو تو بلاؤ—!"

بیرن کو یہ نام بہت پسند آیا اس لئے کہ وہ اس گنوار عورت سے قطعاً مناسبت نہ رکھتا تھا۔ اس دن کے بعد بیرن اس نوکرانی کو ہے پوریلا کے نام سے پکارنے لگا۔ کرسنشیا پہلے تو یہ نیا نام سن کر چونکی لیکن مابعد اس نے احسان مندی یا اپنی تعریف سمجھ کر اسے قبول کر لیا۔ اس بیچاری کو ڈان ژوان کا قصہ معلوم نہ تھا لیکن مالک کے ذریعے ایک خوبصورت نام پا کر اس کی انا کو بڑی تسکین ملی تھی۔ ہے پوریلا کی پکار سنتے ہی وہ اپنے گھوڑے جیسے دانت نکال کر ہنس دیتی اور فوراً مالک کا کام سننے کے لئے دوڑ پڑتی۔

یہ نام اسے مذاق میں عطا کیا گیا تھا اور اس پہ بالکل نہیں پھبتا تھا لیکن بائرن کی ہیروئن ہے پوریلا کی طرح سے کرسنشیا بھی بیرن کو دادِ عیش دلانے میں کُٹنی کا رول ادا کر رہی تھی خود پیار سے خالی ہونے کے باوجود بھی اسے اپنے مالک کی ہوس پرستی پہ ناز تھا، ہر روز بیرنس کے پلنگ پر وہ نئی محبوبہ کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ کیا اسے اپنے مالک کے اس گناہ سے راحت ملتی تھی؟ یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن وہ ان دنوں بڑی خوش تھی اتنا تو یقینی ہے۔ برسوں کی سخت محنت اور مشقت نے اس کے چہرے کو خشک اور جذبات سے عاری کر دیا تھا۔ بیرونس کے پلنگ کو دوسری عورتوں کے ذریعے ناپاک ہوتے دیکھ کر اس کا چہرہ بڑی بھدی مسکراہٹ سے مسخ ہو جاتا۔ ان دنوں اس میں کافی دلیری پیدا ہو گئی تھی یہاں تک کہ وہ عورت کے مکر و فریب سے بھی واقف ہو گئی تھی۔ وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر بیرن کے کمرے میں سے آنے والی کھسر پھسر کو سنتی رہتی اور کبھی کبھی کسی کام کے بہانے اندر ہو آتی۔ بے جان مشین جیسے اب جاندار بن گئی تھی اب وہ پردیسی نوکرانیوں

---

[1] بائرن کی شاعری کا خاص کردار جو اپنی اخلاقی بے عنوانیوں کی وجہ سے بدنام تھا، ہے پوریلا اسکی حسین معشوقہ کا نام تھا

سے دوستی گانٹھنے لگی۔ ڈاکئے کے ساتھ مذاق کرتی اور سبزی بیچنے والیوں کے ساتھ سبزی کے مول تول کے علاوہ دوسرے موضوعات پر گفتگو کرتی۔ رات کو جب نوکروں کے کوارٹروں کی بتیاں بجھ جاتیں تو اس کے کمرے سے گنگنانے کی آواز سنائی دیتی، وہ گوالنوں کے لوک گیت گایا کرتی تھی۔ اس کی آواز ٹوٹی پھوٹی اور بھدی تھی، جیسے کوئی بچہ بہت دنوں بعد پیانو بجانے کا ریاض کر رہا ہو۔ اس کی اس کوشش سے سننے والوں کے دل میں غصے کے ساتھ ساتھ ہمدردی بھی پیدا ہوتی وہ کبھی عنفوانِ شباب میں ایسے گیت گایا کرتی ——— آج جیسے برسوں بعد پھر اس کی روح کا سنگیت پھوٹ نکلا تھا

لیکن بیرن، کرشنیا کے اس کایا کلپ سے بالکل بے خبر تھا۔ اپنے سائے کو دیکھنے کی کسے فرصت ہوتی ہے ہم حیرت انگیز طریقے سے اپنی پرچھائیں کو پیروں تلے روندتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں، کبھی ہمارا سایہ ہم سے آگے نکل جاتا ہے (کسی ناکام خواہش کی طرح) لیکن یہ ہماری شخصیت کا تاریک مگر طنزیہ پہلو ہے ——— کیا اس بارے میں ہم نے کبھی سوچا ہے ——؟ بیرن نے صرف اتنا دیکھا کہ کرشنیا پہلے سے زیادہ چست اور خدمت گزار ہو گئی ہے۔ وہ کبھی کبھی جیسے کتے کو پچکارا جاتا ہے ویسے نوکرانی کی تعریف میں دو چار فقرے کس دیتا۔ اس سے مذاق کرتا اور کبھی اس کے کان اینٹھتا اور انعام میں ایک دو سکے دے ڈالتا، اس کے دئیے ہوئے تعیش کے ردی ٹکٹ کرشنیا کے لئے قیمتی خزانہ بن گئے تھے جنھیں وہ اپنی صندوقچی میں سنبھال کر رکھتی تھی، بیرن کا اعتماد پا کر کرشنیا کی خدمت گزاری بہت زیادہ بڑھ گئی تھی وہ بیرن کی ہر خواہش پوری کرنے کے لئے بیتاب رہتی تھی، وہ اب زندگی کو بیرن کی آنکھ سے دیکھنے لگی تھی۔ بیرن کی عیش پرستیوں میں اسے بھی راحت ملنے لگی تھی۔ بیرن کے ساتھ کسی لڑکی کو دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھتا جس روز رات کو بیرن اکیلا لوٹتا وہ سخت مایوس ہو جاتی۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اب اس کا دماغ بھی چلنے لگا تھا اس کی آنکھوں میں جڑ پن کی جگہ کچھ سمجھداری جھلکنے لگی تھی جیسے بوجھ تلے دبا ہوا حیوان اب انسان بن گیا تھا اس کے ہونٹ اب بھی پہلے کی طرح سخت اور بھنچے ہوئے تھے اب وہ پہلے سے زیادہ چالاک اور خطرناک بن گئی تھی

ایکبار شام کو جب بیرن اکیلا گھر لوٹا تو اسے رسوئی گھر کے دروازے کے عقب میں کھسر پھسر سنائی دی، اتنے میں دروازہ کھلا اور سے پوریا گھبرائی ہوئی باہر نکلی اس نے اپنی نگاہیں نیچی کر کے کہا:

"جناب! میرا کہا معاف ہو، رسوئی گھر میں نان بائی کی لڑکی بیٹھی ہے، وہ خوبصورت اور جوان ہے آپ سے مل کر اسے بڑی خوشی ہو گی"

بیرن حیران ہو کر نوکرانی کے منہ کو دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد اس کے اندر سوئی ہوئی ہوس بیدار ہونے لگی تو

اس نے جواب دیا

"ذرا دیکھوں تو تمھاری حسینہ کو —!"

سنہرے بالوں والی سولہ سال کی ایک لڑکی ہنستی ہوئی رسوئی گھر سے باہر نکلی، جسے پورنیما نے لیے بیرن کی مردانگی کے قصے سنا کر یہاں آنے کے لیے راضی کر لیا تھا۔ بیرن اس لڑکی کو دیکھتے ہی اس کے حسن پر مر مٹا اس نے اسے اپنے کمرے میں چائے پینے کی دعوت دی، لڑکی ذرا گھبرا کر سے پورنیما کی طرف دیکھنے لگی جسے پورنیما جھٹ وہاں سے غائب ہو گئی۔ گھبراہٹ اور شرم سے لڑکی کا چہرہ سرخ ہو گیا

پھر بکرے نے لڑکی سے کہا، "آؤ اندر چلیں —!"

انسانی دنیا میں نفسیاتی تغیر و تبدل اتنا جلدی نہیں ہوتا، اپنے جدید تجربات کے باوجود کرسٹیا کا احساس تصو ابھی ادنیٰ درجے کے جانوروں سے زیادہ نہ بڑھ سکا تھا۔ وہ دور اندیشی کی بجائے وقتی اور سطحی رجحانات سے کام لیتی تھی۔ بیرن کی خدمت میں وہ اس قدر کھو گئی کہ اسے بیرنس کی غیر حاضری کا خیال تک نہ رہا۔ ایک روز سویرے جب بیرا نے آ کر اطلاع کہ اگلے روز دوپہر کو بیرنس لوٹنے والی ہے تو اس کے دل پر جیسے بجلی ٹوٹ پڑی وہ منہ کھولے اس طرح کھڑی رہی جیسے کسی نے اس کے سینے میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ بیرن نے اسے خاموش دیکھ کر کہا،

"کرسٹی دیکھتا ہوں تمھیں مالکن کے آنے کی ذرا خوشی نہیں ہوئی۔ لیکن ہم لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔"

یہ سنتے ہی جیسے کرسٹیا کی روح پھڑک اٹھی اس کے بے رس گال خون کے دباؤ سے سرخ ہو گئے، ہونٹ پھڑکنے لگے وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

"کیوں نہیں .... لیکن .... لیکن انسان کو......"

اس کی آواز بھرا گئی، چہرہ کسی نامعلوم خیال سے تمتما گیا۔ بیرن دیکھ کر چونک اٹھا، وہ چپ چاپ سوئی میں اگر تانبے کے پتیلے کو اتنے زور سے مانجھنے لگی کہ لگتا تھا وہ اپنی انگلیاں زخمی کر ڈالے گی۔

بیرنس کے آنے سے گھر کا ماحول پھر یک جھک سے ناپاک ہو گیا، پھر جھڑکیوں اور گالیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، پتہ نہیں، شاید کسی پڑوسی نے بیرنس کو اس کے خاوند کے "کرتوتوں" کے بارے میں لکھا تھا یا اس کے پیار سے خالی رویے سے وہ ناراض تھی لیکن اتنا صحیح ہے کہ دو ماہ کے علاج سے اس کی صحت میں ذرا فرق نہیں آیا تھا بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ جھگڑالو اور پاگل ہو گئی تھی۔ خاوند بیوی کے تعلقات دن بدن بگڑتے جا رہے تھے، کچھ ہفتے بیرن آرام کے ساتھ اس کی گالیوں اور طلاق کی دھمکیوں کو سنتا رہا۔ بیرنس کو یہ وہم ہو گیا

تھا کہ وہ چاروں طرف دشمنوں میں گھری ہوئی ہے۔ جوش میں آکر اس نے نوکروں پر سختی شروع کر دی
کرسٹیا ہمیشہ کی طرح اب بھی خاموشی کے ہتھیار سے مسلح تھی۔ آجکل وہ رسوئی گھر سے باہر بالکل نہ نکلتی تھی، یہاں تک کہ ہیرنس کے سوالات کیلئے بھی وہ بھاگ تک آ آئی تھی، بلائے جانے پر وہ پتھر بن جاتی اب وہ سوالات کا ایسا منہ پھٹ جواب دیتی تھی کہ ہیرنس سنکر کمرے سے باہر نکل جاتی تھی۔ کرسٹیا کی آنکھوں میں نفرت کا زہر بھرا تھا وہ محسوس کرتی کہ ہیرنس نے آکر اس کا سارا سکھ چین چھین لیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا نام بھی پوریلا!" نام بھی! ہیرن بیوی کی موجودگی میں کبھی کرسٹیا کا ذکر کرنے کی کوشش نہ کرتا لیکن کبھی کبھی بیوی کے پاگل پن سے تنگ آکر وہ رسوئی گھر کی پناہ لیتا تھا اور لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ کر وہ کرسٹیا سے بڑے رنجیدہ لہجے میں کہتا
— بس! اب برداشت نہیں ہوتا —!

مالک کو اپنی پناہ میں آیا دیکھ کر سے پوریلا کو ایک انجانی مسرت ہوتی، وہ زبان سے حوصلہ دینے کی بجائے ممتا بھری نگاہوں سے اپنے پناہ گیر دیوتا کی طرف دیکھتی رہتی۔ یہ خاموش ہمدردی پاکر ہیرن کچھ لمحوں کے لئے اپنا غم بھول جاتا مگر رسوئی سے باہر نکلتے ہی اسے پھر گالیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ دیکھکر کرسٹیا بےبسی سے ہاتھ ملنے لگتی یا اپنا سارا زور لگا کر چاندی کے برتنوں پر پالش کرتی

آخر ایک روز ہیرنس کی شادی شدہ زندگی اور گھٹن طوفان بن کر پھوٹ پڑی اس کا حوصلہ ضبط کی ساری حدیں پار کر چکا تھا۔ ہیرن نے سکول کے طالب العلم کی طرح چپ چاپ جھڑکیاں سننے کی بجائے غصے میں آکر کمرے کا دروازہ زور سے بند کیا۔ کمرے کی ساری کھڑکیاں اس کے اس غصے سے سہم کر کانپنے لگیں

"لعنت ہے ایسی زندگی پر —!" کہکر وہ رسوئی گھر میں چلا گیا اور کانپتی آواز میں کرسٹیا کو حکم دیا
میرا بستر اور بندوق فوراً باہر نکال دو میں ایک ہفتہ کے لئے شکار پر جا رہا ہوں۔ ایسے نرک میں تو شیطان بھی نہیں رہ سکتا —!"

کرسٹیا نے تحسین سے ہیرن کو دیکھا، مالک کے احساس کو بیدار دیکھکر اس کا احترام اور بھی بڑھ گیا اس نے مسکرا کر کہا "— جو حکم —"

اس نے منٹوں میں مالک کا سامان باندھ دیا اور بستر کندھے پر اٹھا کر بگھی میں رکھ آئی، ہیرن اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے چہرے پر وہ بھیانک مسکراہٹ دیکھ کر گھبرا گیا، اسے لگا جیسے کوئی خونخوار جانور اپنے شکار پر جھپٹنے والا ہو۔ کرسٹیا نے آہستہ سے سلام کر کے دھیرے سے کہا
"آپ باہر جا کر عیش کریں میں سب دیکھ لوں گی —!"

تین دن بعد بیرن کو ایک تار ملا ـــ "فوراً چلے آیئے ـــ!"

اسٹیشن پر بیرن کا چچیرا بھائی کھڑا تھا. اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ گھر میں کوئی بھیانک سانحہ پیش آیا ہے اس نے بتایا کہ آج صبح بیڑنس اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی ہے. کمرے میں گیس بھری تھی یہ حادثہ نہیں ہو سکتا کیونکہ گرمی کے موسم میں لوگ گیس سے کمرے گرم نہیں کرتے، اس کے علاوہ کل رات سونے سے پہلے بیڑنس نے ایک درجن سے بھی زیادہ نیند کی گولیاں کھائی تھیں. کرسٹیا کا کہنا ہے کہ کل رات اس نے بیرونس کو گیس کا سوچ دبانے کے لئے سنگھار کمرے میں جاتے دیکھا تھا، ان سب باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے سول سرجن اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ بیڑنس نے خودکشی کی ہے

بیرن کے ہاتھ کانپنے لگے. کرسٹیا کا ذکر آتے ہی اس کا دل خوف سے گھبرا گیا مگر اس نے اپنے خیال کا اظہار کرنا ٹھیک نہیں سمجھا. ڈرائنگ روم میں رشتہ دار ماتم پرسی کے لئے جمع تھے ان کے رویے میں ہمدردی کی جگہ شکوہ زیادہ تھا انھوں نے اپنا فرض سمجھ کر بتایا کہ شہر میں اس کی بدنامی ہو رہی ہے. کیونکہ "لڑکے ہی نوکرانی سڑک پر جا کر چلائی تھی ـــ "ڈوڈو مالکن نے خودکشی کر لی!" اونچے طبقے میں طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی ہیں، بیرن چپ چاپ ساری باتیں سنتا رہا. اس کا سر جھکا رہا تھا، آدھ گھنٹے کی اس لعنت ملامت کے بعد تمام عزیز و اقارب چلے گئے. بیرن کمرے میں تنہا رہ گیا اس اچانک سانحہ سے اس کے جسم و جان دونوں پریشان تھے. یہاں تک کہ اس سے لیجا بھی گیا

اسی وقت کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا

"چلے آؤ ـــ!" بیرن نے جواب دیا

دروازہ کھلا اور ایک معذبی بھیانک صورت اندر داخل ہوئی. بیرن اسے پہچانتا تھا اسے دیکھتے ہی اس کا دم گھٹنے لگا، پاؤں بھاری ہو گئے، اس نے ہلنے جلنے کی کوشش کی لیکن جسم کو جیسے لقوہ مار گیا تھا، وہ خاموش کھڑا رہا. اس خاموشی میں جرم کا احساس پوشیدہ تھا. پیچھے سے کسی نے کرخت اور غیر جذباتی لہجے میں پوچھا!

"کیا جناب آج گھر پر ہی کھانا کھائیں گے ـــ؟"

شدت خوف سے بیرن کانپ اٹھا اس نے لڑکھڑاتی آواز میں جواب دیا

"شکریہ! مجھے بھوک نہیں ہے۔"

وہ معذبی صورت غائب ہو گئی. بیرن کا سر ٹوٹ گیا، وہ پتے کی طرح کانپ گیا. اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور صوفے پر لیٹ کر اپنے من میں چھپے شک شبہات سے لڑنے لگا، رات بھر اسے نیند نہیں آئی. اگلے دن جب وہ رسم کے مطابق سیاہ کپڑے پہن کر اپنی بیوی کے تابوت کے سرہانے کھڑا ہوا تو تب بھی اس کے دل میں یہی شکوک شبہات

اٹھ رہے تھے

بیوی کو دفنانے کے بعد بیرن راجھانی چھوڑ کر چلا گیا، دوستوں اور عزیزوں کے طعنے اس کے لئے ناقابل برداشت تھے۔ ان کی ہمدردی میں ملامت پوشیدہ تھی یہ بیرن کا کورا خیال تھا خیر جو بھی ہو۔ اب وہ اس ماحول میں نہیں رہ سکتا تھا۔ یہاں تک کہ گھر کا فرنیچر، خاص طور سے سونے کا پلنگ (جس میں سے گیس کی تیز بو آرہی تھی) بیرن کو کوس رہا تھا۔ اس ویران گھر میں کرشنیا جو کبھی بیرن کو قابل یقین نظر آتی تھی۔ اب بھوتنی دکھائی دیتی تھی۔ مالکن کی موت سے وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوئی تھی۔

اسٹیشن پر جب سے بیرن نے اس کا نام سنا تھا، تب سے اس کے دل میں ایک نامعلوم سا خوف گھر کر گیا تھا۔ اس کے چہرے کا خیال آتے ہی بیرن کو متلی آنے لگتی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ کمرے سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس کی کرخت آواز میں اور تیل سے چپڑے بالوں میں ایک شدید حیوانیت اور بے رحمی چھپی تھی اس سے کسی طرح دامن بچانے کے لئے بیرن بے چین ہو رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے اس عورت کی سنگین انگلیوں نے اس کے گلے کو دبوچ رکھا ہے اس نے چپ چاپ اپنا سامان باندھا اور ایک چٹ لکھ کر چھوڑ گیا کہ وہ اپنے کسی دوست کے پاس جا رہا ہے۔

گرمیوں تک وہ راجھانی سے باہر رہا۔ صرف ایک بار وہ اپنی مرحومہ بیوی کی جائداد کے سلسلے میں ایک آدھ دن کے لئے آیا وہ اس منحوس عورت کی نظروں سے بچنے کے لئے ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ کرشنیا کو اس کے آنے کا پتہ نہیں چلا، وہ دن بھر داسی سی رسوئی میں بیٹھی رہتی تھی اور اب ہفتے میں ایک کی بجائے دو بار گرجے جاتی تھی۔ بیرن کا وکیل اسے ہر ماہ تنخواہ دیتا تھا اور گھر کا سارا انتظام دیکھتا تھا۔ بیرن نے اسے ایک بھی خط نہیں لکھا، اس طویل انتظار سے اس کا چہرہ نحیف اور کمزور ہو گیا تھا وہ پھر پہلے جیسی جاہل اور کاہل ہو گئی تھی۔ اس طرح کئی ماہ بیت گئے موسم خزاں میں بیرن کو ایک ضروری کام کے سلسلے میں گھر آکر ٹھہرنا پڑا، کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ ہچکچا رہا تھا، دوستوں کے ساتھ رہنے سے وہ ماضی کے دردناک واقعے کو بھول سکنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر اس منحوس کا خیال آتے ہی اس کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس کو لگا جیسے کوئی نامعلوم ہاتھ اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اس نے اپنے اندر وہی تکان محسوس کی جیسی بیرنس کی موت کے بعد اسے ہوئی تھی۔

اس کے قدموں کی آہٹ پاتے ہی کرشنیا رسوئی گھر سے دوڑی ہوئی آئی، اپنے مالک کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا، دونوں کی نظریں ایک ساتھ جھک گئیں۔ دونوں چپ چاپ فرش کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر کرشنیا نے بیرن کا کوٹ اور ہیٹ کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ بیرن چپ چاپ جاکر کھڑکی کے آگے کھڑا ہو گیا۔

کرسنٹیا کے جانے کے بعد اس نے اندر سے دروازہ بند کرلیا۔

اتنے لمبے عرصہ کے بعد ان کی یہی سلام دعا تھی۔ بیرن کا خیال تھا کہ کچھ ہی دنوں میں وہ اپنی نفرت پر قابو پالے گا۔ مگراب تو کرسنٹیا کے قدموں کی آہٹ سے ہی اس کا سر چکرانے لگتا۔ اس کے پکائے کھانے میں سے وہ ایک بھی نوالہ نہ لے سکتا۔ اس کے منحوس سائے سے بچنے کے لئے وہ علی الصبح ہی گھر سے باہر چلا جاتا اور رات کو کافی دیر سے لوٹتا اگر کبھی اس کا سامنا ہو بھی جاتا تو وہ بنا اس کی طرف دیکھے گھر کے کام کاج کے متعلق حکم دینے لگتا تھا۔ جب تک وہ اس کے سامنے رہتی اس کا سانس لینا ایک دشوار ہو جاتا۔

دن بھر کرسنٹیا رسوئی گھر میں اسٹول پر بیٹھی کسی گہرے خیال میں غرق رہتی۔ اسے بھوک پیاس لگنی بند ہوگئی تھی، وہ کسی سے بولتی چالتی نہ تھی۔ ہر وقت وہ خوف زدہ مالک کے بلاوے کے انتظار میں رہتی جیسے کوئی قصوروار کتا مالک سے پیٹے جانے کے بعد مالک کی سیٹی کی آواز سننے کیلئے بے قرار رہتا ہے۔ اس سے کیا قصور ہوگیا ہے جس کی وجہ سے اس کے مالک نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ مالک کی ناراضگی سے بڑا قہر کوئی نہیں ہوسکتا

تین دن بعد دروازے کی گھنٹی اچانک بجی اور ہاتھ میں ہینڈ بیگ لئے ایک بوڑھا آدمی دکھائی دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ بیرن کا نیا خانساماں ہے اور مالک سے ملنا چاہتا ہے۔ کرسنٹیا کا چہرہ ایکدم اتر گیا، کچھ لمحے چپ رہنے کے بعد اس نے اپنا بے جان ہاتھ اٹھا کر کہا

"اندر چلے جاؤ۔ ادھر۔!" اتنا کہہ کر اس نے رسوئی گھر کا دروازہ زور سے بند کرلیا

نئے خانساماں نے آکر بیرن کی مشکل حل کردی، وہ بڑا سمجھدار تھا، اس سے پہلے وہ کئی بڑے خاندانوں میں کام کرچکا تھا یہ سن کر کرسنٹیا جیسے پتھر کی مورتی بن گئی، وہ خالی النظر کھڑکی کے باہر دیکھا کرتی، کام کے وقت عجیب سا پاگل پن سوار ہو جاتا، اب سوئی سے باہر کی دنیا کے ساتھ اس کا تعلق بالکل نہ رہا تھا۔ پندرہ دن بعد نیا خانساماں بیرن کے اسٹڈی روم میں آیا اور آکر چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ اس سے پہلے بھی وہ ایکبار کرسنٹیا کی کی شکایت کرچکا تھا۔ اس نے مالک سے کہا تھا کہ وہ فوراً نوکرانی کو نوٹس دے کر نکال دے مگر بیرن کو کرسنٹیا پر جیسے رحم آگیا تھا۔ یہ دیکھکر خانساماں نے بھی زیادہ زور نہیں دیا، لیکن اس دفعہ وہ بہت پریشان نظر آرہا تھا بیرن نے اسے سمجھایا کہ وہ گھر کی پرانی نوکرانی ہے، ایسے بے قصور اسے نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن بوڑھا خانساماں ٹس سے مس نہ ہوا، اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔

حضور شاید آپ مجھے پاگل سمجھیں لیکن .... لیکن مجھے اس عورت سے سخت ڈر محسوس ہوتا ہے.... بری

خطرناک عورت ہے...... آپ نہیں جانتے ......

بیرن کے قلب میں پھر شک کی بجلی کوندگئی لیکن بوڑھے خانساماں نے کوئی ثبوت نہیں دیا تھا، اس نے خود کو سنبھال پوچھا

"کیوں، کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے ـــ؟"

"یہ جناب میں یقینی طور سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت عورت نہیں جانور ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں یہ میرا گلا نہ دبا دے، کل جب میں اس کو آپ کے احکام سنا رہا تھا تو اس نے میری طرف اس طرح دیکھا تھا جیسے...... جیسے وہ ابھی میری گردن میں اپنے دانت گاڑھ دے گی۔ حضور مجھے اس کے ہاتھ سے پکے ہوئے کو کھانے سے سخت ڈر لگتا ہے، کیا پتہ وہ آپ کو یا مجھے زہر دے کر مار ڈالے۔ حضور نہیں جانتے وہ کتنی خطرناک ہے، وہ ایک لفظ نہیں بولتی ہے، لیکن مجھے یقین ہوگیا ہے وہ کسی کا ضرور خون کر ڈالے گی ـــ"

بیرن نے گھبرا کر خانساماں کی طرف دیکھا، وہ سوچنے لگا کیا اس نے کرسٹیا کے متعلق ساری افواہیں سن لی ہیں، بیرن نے اپنے ہاتھوں کی لرزش چھپانے کے لئے سگار کو ایش ٹرے میں رکھدیا، خانساماں کے چہرے پر شک کا کوئی تاثر نہ تھا، وہ سوچنے لگا، خانساں کا خیال ٹھیک ہے، اب کرسٹیا سے پیچھا چھڑانے ہی میں اس کی بہتری ہے

بیرن نے کہا ـــ "دیکھو جلد بازی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، ہمیں کچھ روز اور ٹھہرنا چاہئے، اگر وہ پھر کوئی بد تمیزی کرے تو تم مجھ سے پوچھے بنا اسے نوٹس دے سکتے ہو ـــ"

"جو حکم جناب" کہہ کر خانساماں چلا گیا

بیرن نے راحت کا سانس لیا، وہ چاہتا تھا کرسمس میں جب وہ گھر پر نہیں ہوگا تب کرسٹیا کو نکالنے میں آسانی ہوگی، اس کے دل کا بوجھ یکدم جیسے ہلکا ہوگیا

اگلے روز علی الصبح ناشتہ کے بعد بیرن ابھی اپنے مطالعہ کے کمرے میں جاکر بیٹھا ہی تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ بیرن نے اخبار کے صفحے الٹتے ہوئے کہا

"آجاؤ ـــ!"

کرسٹیا دھیمی چال سے اندر داخل ہوئی، اس کی صوت دیکھکر بیرن دنگ رہ گیا۔ وہ پہلے بھی دبلی تھی لیکن اب تو بالکل ہڈیوں کا پنجر دکھائی دے رہی تھی۔ کالے لباس میں جھالکل ڈائن نظر آرہی تھی، اسے قالین پار کرنے کی ہمت نہ ہوئی، چپ چاپ وہ فرش پر کھڑی ہوگئی، اس کی طرف دیکھکر بیرن کے دل میں ذرا رحم امنڈ آیا

مگر اس شدید جذبے کو اس نے سختی سے دبا کر پوچھا

"کیا بات ہے کرسنشی!" انجانے میں اس کا لہجہ نرم ہونے کی بجائے سخت ہو گیا۔

کرسنشیا چپ چاپ قالین کی طرف دیکھتی رہی بڑی کوشش کرنے پر وہ اتنا کہہ پائی

"خانساماں کہتا ہے ...... کہتا ہے کہ آپ نے مجھے نوکری سے نکال دیا ہے"

سن کر بیرن کو بڑا دکھ ہوا، وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا، وہ اس معاملے میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا اس نے ذرا رک کر اسے سمجھایا کہ گھر کے نوکروں کو آپس میں نہیں لڑنا چاہیئے۔ اگر کرسنشیا خانساں کے ساتھ ٹھیک سلوک کرے تو معاملہ اب بھی درست ہو سکتا ہے

کرسنشیا نے کوئی جواب نہ دیا، اس کی نگاہیں اب بھی قالین کو گھور رہی تھیں، وہ بیرن کے منہ سے ہمدردی کا ایک بول سننے کے لئے کھڑی تھی جو اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد آہستہ سے اس نے پوچھا

"میں صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ کیا خانساماں نے آپ سے پوچھ کر مجھے نوٹس دیا ہے۔؟"

وہ دل ہی دل میں خوف زدہ رہ گیا۔ کیا وہ اس کو دھمکی دے رہی ہے لمحہ بھر میں ہی اس کی ہمدردی ہوا ہو گئی اور مہینوں سے سلگتی نفرت کی آگ اس کے سینے میں پھوٹ پڑی، اس نے سخت افسرانہ لہجے میں جواب دیا

"ہاں کرسنشیا بات کچھ ایسی ہی ہے۔ میں نے گھر کے انتظام کے لئے خانساں کو مقرر کر دیا ہے، اگر وہ تمہیں پسند نہیں کرتا تو تمہیں بہرحال نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اگر تم آئندہ خانساں سے تمیز کے ساتھ پیش آؤ تو میں تمہاری سفارش کر سکتا ہوں"

اب وہ اس کی ہر دھمکی سننے کے لئے تیار تھا۔ کرسنشیا کی آنکھوں میں کسی خوف زدہ جنگلی جانور کا احساس جھلک رہا تھا۔ جو جیسے اپنی پناہ گاہ میں شکاری کتے کو دیکھ کر سہم گیا ہو

"حضور کی مہربانی، میں جناب کو تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ اس لئے فوراً یہاں سے چلی جاؤں گی"

کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی

اسی روز شام کو جب بیرن اوپر دیکھ کر لوٹا تو اس نے اپنی میز پر ایک دیہاتی انداز کی صندوقچی پڑی دیکھی صندوقچی میں کرسنشیا نے، بیرن کے ارسال کردہ پوسٹ کارڈ، دو تھیٹر ٹکٹ اور ایک چاندی کی انگوٹھی سنبھال کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ نوٹوں کا ایک پلندہ تھا (جو کرسنشیا کی زندگی بھر کی کمائی تھی) اور اس دیہاتی فوٹو گرافر کی کھینچی گئی بیس سال پرانی ایک تصویر تھی، جس میں کرسنشیا کی آنکھوں میں ویسا ہی جذبہ عیاں تھا جیسا آج صبح تھا

ہیرن نے غصے میں خانساماں کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی۔ اس نے پوچھا کہ اس کی میز پر یہ کوڑا کیسے آیا ___؟

خانساماں پوچھ تاچھ کے لئے رسوئی میں چلا گیا لیکن وہاں کرسٹیا کا کہیں پتہ نہ تھا!

دوسرے دن ہیرن نے اخبار میں پڑھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے دریائے ڈینیوب میں چھلانگ لگاکر خودکشی کرلی ہے۔ اس نے دل میں سوچا کہ وہ عورت سے چوری کیا ہی تھی۔

(مترجم: ہرچندر الکونٹس)

کرشن کانت شرما

بھگوان بدھ اور ایک عورت

کوٹھی کے احاطہ میں نرم نرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی، گل موہر اور گیندے کے پھول پھاگن کی سبک رو ہواؤں میں جھوم رہے تھے، مالی ابھی ابھی پودوں کو پانی دے کر گیا تھا پھولوں کی مہک اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ایک پر مسرت اور پرسکون کیفیت پیدا کر رہی تھی، باہر باغیچہ میں بچے کھیل رہے تھے، اندر ریڈیو روم میں ایک تپائی پر میں بیٹھا بچوں کا پروگرام سن رہا تھا۔ اندازہ لگائیے اس وقت میری عمر کیا ہوگی، یہی زیادہ سے زیادہ پندرہ سولہ سال اس عمر کے بعد لوگ بچوں کے پروگرام کے متحمل نہیں ہو سکتے، اچانک بچوں نے مل کر جے بھارت کہا اور پھر اسٹیشن پر کوئی صاحب شلغم کی کاشت کے بارے میں مفید مشورے دینے لگے۔ غالباً آپنے اندازہ لگا لیا ہے کہ میں نے ریڈیو بند کر دیا ہوگا، کیونکہ میری عمر کا کوئی آدمی شلغم کی کاشت کے بارے میں سنجیدگی سے غور نہیں کر سکتا، ہاں میں نے واقعی ریڈیو بند کر دیا اور پاس ایک میز پر پڑے امریکی رسالے میں نیم عریاں عورتوں کی تصویریں دیکھنے لگا — واضح ہو کہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں ہم جنسی، جمالیات پر غور کرنا شروع کر دیتے ہیں اور صنف لطیف کے جسمانی زاویوں اور قوسوں سے ہمیں دلچسپی اور تجسس ہونے لگ جاتا ہے — ہاں میں عریاں امریکی عورتوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک باہر صحن میں بچوں کے شور وغل نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے رسالہ میز پر رکھ دیا اور ریڈیو روم سے باہر بھاگا۔ ظاہر ہے کہ بچے شور وغل کو بہت پسند کرتے ہیں، چاہے وہ لوگوں کی بھیڑ کا شور ہو، کسی مندر کے کیرتن کا یا کسی بارات کے بینڈ باجے کا، اور اسے دیکھنے کے لئے وہ ہر کام چھوڑ دیتے ہیں، چاہے وہ نیم عریاں امریکی عورتیں ہوں، یا ریڈیو پر شلغم کی کاشت کے بارے میں مفید مشورے، یا پھولوں اور مٹی کی ملی جلی سوندھی سوندھی خوشبو، پرسکون اور پر مسرت!!

میں باہر کی طرف بھاگا تو میں نے دیکھا، اوشا نے اپنی دونوں انگلیوں کے درمیان ایک خوش رنگ تیتری دبا رکھی اور گل موہر کی کیاریوں کے درمیان شور مچا رہی تھی، باقی بچے رنگ برنگ کپڑے پہنے اس کے گرد دائرہ میں ناچ رہے تھے، میں نے دیکھا، غریب تیتری بہت دکھی تھی، اسکی سانس پھولی ہوئی تھی — اوشا کی انگلیوں کے درمیان وہ

اتنی بے بس تھی کہ اپنے پر بھی نہ پھڑپھڑا سکتی تھی۔ وہ اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے سبھی بچوں کو ملتجیانہ پیغام بھیج رہی تھی مگر اسے اپنا مسیحا نہیں مل رہا تھا

میں نے کہا۔ "اوشا! چھوڑ دو، اس تتلی کو۔ بے چاری مر جائے گی!"

"نہیں چھوڑتے!" اوشا نے طفلانہ رقص کرتے ہوئے کہا

"تمہیں کیا مل جائے گا بے چاری کو مار کر؟" میں نے ہمدردی کے بجائے دلیل کا دامن پکڑا۔

"ہم اسے کتاب میں رکھیں گے" اوشا کہنے لگی "اور پھر کتاب میں اس کے سارے رنگ چھپ جائیں گے"

"تمہیں اس کے رنگ مل جائیں گے اس بے چاری کی جان جائے گی"

"جاؤ، ہم نہیں چھوڑتے" اوشا نے اپنا رقص بند کر دیا۔ "تم کوئی مہاتما بدھ ہو، کیا؟"

اوشا نے شاید نصاب کی کسی کتاب سے بھگوان بدھ اور ان کے چچیرے بھائی دیودت کا قصہ پڑھ رکھا تھا۔ دیودت نے ایکبار فضا میں تیر چھوڑا جو اڑتے ہوئے ایک ہنس کو لگا۔ ہنس نیچے گر گیا۔ دیودت بہت خوش ہوا۔ بھگوان بھی وہیں وِہار کر رہے تھے۔ دیودت تڑپتا ہوا ہنس ان کے پاس لے آیا۔ بھگوان بولے "اوشا! سب جیووں، پشو پکشیوں میں پران ہوتے ہیں کسی کو مارنے یا ستانے سے اسے تو دکھ ہوتا ہی ہے، پر ہمیں بھی شانتی نہیں مل سکتی۔ ایک کشنک آنند کے لیے تم نے اسے اتنا کشٹ دیا؟"

اوشا بولی "لیکن تمہیں اس سے کیا لینا ہے بھگوان؟"

"مجھے دکھ ہوتا ہے" بھگوان بولے "جب میں کسی پرانی کو کسی سنکٹ میں دیکھتا ہوں"

"تمہاری بلا سے" اوشا کہنے لگی

"یہ سنسار دکھوں کا گھر ہے" بھگوان پھر بولے "اور واستو میں اس کے اندر جتنے بھی دکھ ہیں وہ سب ہم ہی نے بنائے ہیں۔ یدی ہم کسی کو کشٹ نہ دیں تو نشچے ہی یہ سنسار دکھ کی بجائے سکھ کا ساگر بن جائے، نشچے ہی جیون میں سندرتا آ جائے۔ اس میں سنگیت پیدا ہو جائے"

اس کے جواب میں اوشا نے ایک نقرئی قہقہہ لگا دیا اور دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر ناچنے لگی۔ اچانک باہر سڑک پر سے کسی بارات کے بینڈ کا شور سنائی دیا۔ سبھی بچے باہر کی طرف بھاگے، کیونکہ بچوں کو شور بہت مرغوب ہوتا ہے اور اسے دیکھنے کے لیے وہ سب کام چھوڑ دیتے ہیں، چاہے وہ نیم عریاں عورتوں کی تصویریں ہوں یا تیتری کے رنگ۔ اوشا نے بھی تیتری زمین پر پٹک دی اور باہر کی طرف بھاگی

بھگوان نے تیتری اٹھائی، نل پر سے تھوڑا سا پانی اپنے اوک میں بھر لائے اور انگلی کے جھٹکے سے پانی کے

کچھ قطرے تیتری پر چھڑک دئے مگر تیتری جا چکی تھی اس دنیا سے بہت دور، جہاں دکھ ہی دکھ ہیں، وہ دکھ جو ہم نے خود ہی پیدا کئے ہیں جن کی تخلیق میں ہم رات دن مصروف رہتے ہیں تاکہ زندگی میں خوبصورتی نہ پیدا ہو سکے۔ موسیقی نہ پیدا ہو سکے، تناسب اور نرمی نہ پیدا ہو سکے

اور بھگوان سوچنے لگے "ویدوں میں اوشا کا جو روپ ہے وہ کتنا انیتہ ہے! وید کہتے ہیں اوشا کے آنے کی پرتیکشا ہے۔ پرنتو یہ اوشا تو کیول نراشا اور دکھ کی واہیکا ہے! وید کہتے ہیں، اوشا کے ماتھے پر آنند اور آشا کی لالی ہے، پرنتو......"

سلگتے دل کے ساتھ بھگوان نے مردہ تیتری کو ایک پتھر پر رکھ دیا اور ریڈیو روم میں جاکر شلغم کی کاشت کے بارے میں مفید مشورے سننے لگے

ان دنوں میرے پتاجی پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں میں ایک پرائمری اسکول کے مدرس اعلیٰ تھے، کسی کام سے انھیں لکھنؤ جانا پڑا، میری ضد اور ماتاجی کی سفارش پر وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ہم لوگ پہلی بار لکھنؤ جا رہے تھے، پتاجی کے ساتھ پڑھے، ساتھ کھیلے دوست لالہ پرجاپتی وہاں سرکاری عمارتوں کے ٹھیکیدار تھے، شہر سے دور ایک پرفضا مقام پر انھوں نے اپنے لئے ایک کوٹھی بنوا رکھی تھی، میں اور پتاجی انہی کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔

پتاجی اپنے کام کے سلسلے میں سارا دن باہر گھومتے، میں گھر پر رہتا، لالہ پرجاپتی کے دو لڑکے کالج میں پڑھتے تھے، اوشا ان کی اکلوتی بیٹی تھی، وہ شہر میں کسی اسکول میں چھٹے درجہ میں پڑھ رہی تھی، لالہ جی کو باغبانی کا خاص شوق تھا کوٹھی کے احاطہ میں انواع و اقسام کے پھول لگوا رکھے تھے۔ اپنے کام کاج سے فارغ ہوتے تو باقی وقت بچوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے یا باغیچہ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتے، اوشا سے انھیں خاص پیار تھا لڑکوں کے بارے میں کبھی کوئی پوچھ تاچھ نہ کرتے، مگر جونہی کوٹھی کے احاطہ میں قدم رکھتے فوراً اوشا کو پکارتے اور سب سے پہلے یہی پوچھتے "کیا تم نے کھانا کھا لیا ہے، بیٹی!"

"نہیں ڈیڈی!" اوشا نے کہا۔ "آج مٹر پنیر بنا تھا جو ہمیں ایک دم اچھا نہیں لگتا" اوشا نے غالباً بہت سی فلمیں دیکھنے کے بعد اس قسم کی زبان اپنائی تھی۔

لالہ کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں "میں نے کئی بار رام سنگھ سے کہا ہے کہ کھانا بنانے سے پہلے اوشا بیٹی سے پوچھ لیا کرے، مگر الو کا پٹھا سنتا ہی نہیں"۔ پھر انھوں نے پکارا "رام سنگھ"!

رام سنگھ ہانپتا ہوا رسوئی سے نکلا۔ چھریرا بدن، لمبی مونچھیں، گردن ایک طرف گری ہوئی، عمر پینتیس سال

سے زیادہ نہ ہو گی۔ مگر مگر ہر وقت جھکائے رکھتا تھا۔

"آج رسوئیں میں کیا بنا تھا؟" لالہ جی پوچھنے لگے

"مٹر اور پنیر سرکار!" رام سنگھ نے گردن کو ایک جھٹکا دے کر کہا

"سرکار کے بچے!" لالہ جی ابل پڑے۔ تم نہیں جانتے، بٹیا کو یہ کھانا پسند نہیں! دفع ہو جاؤ یہاں سے!"

رام سنگھ زمین کی طرف دیکھتا ہوا ہاتھ ملنے لگا۔

"میں کہتا ہوں میری نظروں سے دور ہو جاؤ" لالہ جی غصے سے کانپ رہے تھے

انگوچھا سنبھالتا ہوا رام سنگھ رسوئیں میں بھاگ گیا۔

شریمتی پرجاپتی رسوئیں کے دوسرے دروازے سے نمودار ہوئیں اور بولیں "ادشا کو تو ہر بات میں کیڑے نکالنے کی عادت ہے، کبھی ایک چیز پسند کرتی ہے کبھی دوسری۔ آپ خواہ مخواہ نوکر پر بگڑ رہے ہیں!"

"ہاں، میں پاگل جو ہوں" پرجاپتی اپنی بیوی پر بگڑنے لگے "آپ لوگوں کے لئے سارا دن جھینکتا ہوں کبھی اس انجینئر کی خوشامد کبھی اس افسر کی چاپلوسی، مجھ سے بڑا پاگل اور کون ہوگا؟ رام سنگھ! رام سنگھ!!" انھوں نے پھر رام سنگھ کو پکارا

رام سنگھ پھر رسوئیں سے بھاگا چلا آیا

"دیکھو!" لالہ جی کہنے لگے "تین برٹوسٹ تیار کرو اور ایک آملیٹ! جلدی!! اور ایک ہاف سیٹ چائے" رام سنگھ جانے لگا "اور دیکھو آملیٹ کو بہت زیادہ روسٹ نہ کرنا۔ سرخ آملیٹ بٹیا کو پسند نہیں سمجھے! جاؤ... اب جاؤ، بھی!"

انھوں نے ادشا کو گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگے۔ پھر جیب سے کچھ ٹانیاں نکال کر اسے دیں، ادشا نے دو منہ میں ڈال لیں، باقی جیب میں

"یہ لڑکا ہم کو ایک دم اچھا نہیں لگتا"۔ ادشا نے بھگوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پرجاپتی نے پہلے بھگوان کی طرف دیکھا اور پھر اپنی بیٹی کی طرف، پھر بولے "کیوں کیا بات ہے بیٹی"

"یہ ہمیں کھیلنے نہیں دیتا"۔ ادشا نے اپنے ماتھے پر ایک ہلکی سے شکن پیدا کر کے جواب دیا۔

"تمھیں کیا تکلیف ہے" پرجاپتی کے مخاطب بھگوان تھے۔ ان کے لہجے میں تلخی ابھر رہی تھی۔

بھگوان بولے "کچھ نہیں چاچا جی! ادشا نے آج باغیچے میں ایک تیتری کو پکڑ لیا، بچاری تیتری کی سانس پھول گئی، اس کے پنکھ ٹوٹ گئے مگر ادشا نے بڑی بے دردی سے اسے مار ڈالا، میں نے روکا مگر یہ نہ مانی"

"مگر میں یہ پوچھتا ہوں، اس کو منع کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟" لالہ جی کی تلخی عروج پر تھی۔

"میں نے تو صرف منع کیا تھا" بھگوان بولے۔ بس اور کچھ بھی نہیں کہا"

"بہت برا کیا تم نے!" بھگوان کو بچارتے ہوئے لالہ جی نے طنزاً کہا "گلا گھونٹ کر مار ڈالتے بیچاری کو، تیری پر تم کرنا جو ٹھہرا، ایڈیٹ!"

انھوں نے پھر اوشا کو گود میں اٹھالیا، اور پاؤں پٹکاتے ہوئے ڈرائنگ ہال میں چلے گئے۔

اور بھگوان سوچ رہے تھے ـــــ ویدوں کے اندر پرجاپتی کا جو ورنن ہے، وہ کتنا آستیہ ہے! سنہری گربھ سے جنم لینے والا ویدوں کا پرجاپتی پرجا کا پالن بھی کرتا ہے، انھیں، دھن، بل، سکھ، اور آنند دیتا ہے، پرنتو سارے برہمانڈ کو اپنے وش میں کرتا ہے تو ایک طرف رہا یہ پرجاپتی تو ....؟

اور بھگوان ادھر ریڈیو روم میں جاکر امریکی دوشیزاؤں کی تصویریں دیکھنے لگے۔

بی اے پاس کرنے کے بعد مجھے الہ آباد کے ایک بنک میں منیجر کی جگہ مل گئی، پتاجی اپنی ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے، بہنیں اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں، چھوٹے بھائی کو تعلیم سے دلچسپی نہ تھی، وہ گاؤں سے پانچ میل پر ایک ربڑ فیکٹری میں ملازم تھا، اور تنخواہ سگرٹوں، فلموں اور فلمی رسالوں کی نذر کر دیتا، پتاجی کی قلیل پنشن سے ان کا گزارہ مشکل تھا، اس لئے انھیں اپنے ساتھ الہ آباد لیتا گیا، ماتاجی نے گاؤں میں ہی رہنا پسند کیا

بنک میں چھٹی کا وقت ہوتا تو پتاجی آجاتے اور وہاں سے ہم لوگ شام کی سیر کے لئے نکل جاتے، ایک آدھ گھنٹہ گھومنے کے بعد لوٹتے، بازار سے کچھ سودا سلف خریدتے، پھر گھر آجاتے، پھر پتاجی کھانا بنانے لگ جاتے، میں باسی اخبار کا ایک آدھ کالم دیکھ لیتا۔

اس دوران میں ایک اور واقعہ پیش آیا، پتاجی نے خرابیٔ صحت کے باعث شام کا گھومنا بند کر دیا تھا، ایک دن میں اکیلا تربینی پر ٹہلنے چلا گیا، تین دن کی لگاتار بارش کے بعد آسمان ایک دم صاف ہو گیا تھا اور دھوپ بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی، میں لکڑی کے ایک بڑے کٹّے پر بیٹھ گیا اور دریا میں ڈوبتے سورج کی کرنوں کا نظارہ کرنے لگا۔ اتنے میں کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، میں نے گھوم کر دیکھا تو بیس بائیس برس کا ایک نوجوان کھڑا تھا، میرے مڑتے ہی اس نے انگوٹھے سے اشارہ کیا، میں پھر گھوما تو میرے پیچھے ایک لڑکی کھڑی مسکرا رہی تھی، گورا گداز بدن، چہرے پر شباب کی سرخی تلاطم کر رہی تھی، کلائیوں پر پلاسٹک کی کالی چوڑیاں بہت بھلی لگتی تھیں، خوبصورت بلاوز اور پیازی ساڑھی میں ملبوس وہ لڑکی اس طرح کھڑی تھی جیسے وشوامتر کا تپ بھنگ

کرنے کے بعد بھگوان بدھ کا گیان نشٹ کرنے کے لئے مینکا آکاش سے اتر آئی ہو۔

"پہلے تمہیں پہچانا نہیں، دیوی!" بھگوان بولے۔

"واہ! مجھے نہیں پہچانا؟" اپسرا کہنے لگی۔

"وشواس کیجئے مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا۔" بھگوان نے اپنا دایاں بازو اٹھا لیا، جیسے عجائب گھروں میں پڑے گاندھارا مدرسۂ فن کے اکثر بودھی مجسموں نے اٹھایا ہوتا ہے

"آپ بھلے ہی بھول جائیں" وہ کہنے لگی "مگر میں آپ کو کبھی نہیں بھول سکتی ایکبار لکھنؤ میں آپ ہماری کوٹھی پر ٹھہرے تھے"

بھگوان بدھ اپنا دماغ کریدنے لگے، ان گنت واقعات، ان گنت ملاقاتیں، دکھ، پریشانیاں، خوشیاں امیدیں اور مایوسیاں، کچھ بھی تو یاد نہیں آ رہا تھا، غموں سے بھری اس زندگی میں کسی خاص ملاقات کو تلاش کرنا گھاس کے ڈھیر سے سوئی کو تلاش کرنے کے مترادف تھا۔

"ارے ہاں!" وہ اچانک بول اٹھے۔ "تو آپ آشا جی ہیں! اکشما کرنا میں تو بالکل بھول گیا تھا۔

"آشا نہیں "اوشا کہئے"، اوشا نے بھگوان کے کوٹ کا ایک بٹن چھیڑتے ہوئے کہا۔

"اوہ! ٹھیک ہے اوشا! بھگوان نے نام دہرایا، کہئے، کیا حال ہے آپ کا؟ آجکل کیا کر رہی ہیں آپ"

"کالج میں پڑھتی ہوں" اوشا نے اپنی چمکدار آنکھوں کو گھما کر کہا "تھرڈ ایر میں"

"اور ان کا بری ہے" بھگوان نے نوجوان کی طرف اشارہ کیا

"ان سے ملئے" اوشا نے تعارف کرایا "یہ ہیں شری ایش میرے ساتھ تھرڈ ایر میں پڑھتے ہیں! بمبئی میں کپڑے کی دو ملیں ہیں ان کی اور احمد آباد میں......"

بھگوان نے ایش کے ساتھ مصافحہ کیا، مگر تعارف کے دوران میں اوشا نے بھگوان کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا، اور نہ ہی ایش نے کچھ پوچھا، دونوں کو ایک دوسرے سے مل کر بڑی مسرت ہوئی اور تعارف کی رسم ختم ہوئی

"تو آپ کو ایجوکیشن والے کالج میں پڑھتی ہیں!" بھگوان کہنے لگے، ان کے لہجہ میں استفسار بھی تھا اور حیرانی بھی وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف نہ تھے مگر مخلوط تعلیم کے خلاف ضرور تھے، لیکن اس اختلاف کا اظہار کر کے غموں سے بھری اس دنیا میں وہ ایک نئے غم کا اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے

"شام کو کبھی کبھی ادھر نکل آتی ہوں" اوشا نے اپنی آنکھوں کی چمک کو اور تیز کرتے ہوئے کہا۔ "کتنا سندر درشیہ ہے! سبلائم!!"

اور وہ پانی میں تیرتی شفق کا نظارہ کرنے لگی۔ وہ سر سے پاؤں تک لہو کا ایک قطرہ تھی اس کے سرخ و سپید چہرے پر ڈھلتے سورج کا پرتو کتنا بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ صبح کی سرخی، شام کی شفق کو دیکھ رہی تھی اور سرخیوں کے اس سنگم پر کھڑے بھگوان بدھ اپنے فلسفے کی ڈگمگاتی کشتی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے، پھر وہ کہنے لگے، "اوشا! کبھی کبھی آیا کرو، ہم گول گنج میں رہتے ہیں اجوک کے پنواڑی سے مکان پوچھ لینا، وہ اپنا لڑکا تمہارے ساتھ بھیج دے گا۔

"سرٹنلی! سرٹنلی!" اوشا نے تیزی سے کہا، مگر دیکھئے اس ہفتے نہ آسکوں گی، ہمارے چالیس اسٹوڈنٹس کا ایک گروپ سنو فال دیکھنے کے لئے دارجلنگ جا رہا ہے، لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں گے، بڑا مزہ رہے گا۔

"لڑکے اور لڑکیاں؟" بھگوان پھر چونک پڑے، ان کا تجربہ بتاتا تھا کہ بھکشوؤں اور بھکشونیوں کے ایک ساتھ رہنے سے مٹھوں میں کئی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں، اپنے رفیق خاص آنند کے بار بار تقاضہ کرنے پر بھی انھوں نے مخلوط مٹھوں کی مخالفت کی تھی مگر اوشا کے سامنے اس اختلاف کا اظہار کر کے غموں سے بھری اس دنیا میں وہ ایک نئے غم کا اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"ہاں ہاں!!" اوشا کہہ رہی تھی لڑکے اور لڑکیاں دونوں، میں آپ کو ایک بڑا مزیدار واقعہ سناتی ہوں، ایکبار ہمارے سٹوڈنٹس کا ایک گروپ لکھی پور کے گرم پانی کے چشمے دیکھنے گیا، چشمہ کے ایک طرف نہانے کا پربندھ بھی تھا جب ہمیں اس کا پتہ لگا تو بھاگم بھاگ مچ گئی، لڑکیاں اس کوشش میں تھیں کہ وہ باتھ پر پہلے قبضہ کریں اور لڑکے یہ چاہتے تھے کہ لڑکیوں کو وہاں بالکل نہانے نہ دیا جائے، کیوں کہ ہم نے وہاں صرف ایک گھنٹہ ٹھہرنا تھا، آخر جیت ہماری ہوئی، ہم باتھ میں گھس گئیں اور کپڑے اتار کر لگیں نہانے، تھرڈ ایئر کا ایک لڑکا بڑا ہٹیلا تھا، کہنے لگا "اگر لڑکیوں نے اس طرح نیچا دکھا دیا تو ہم کالج میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے" اس نے انڈرویئر پہنا اور باتھ میں گھس آیا، پھر کیا تھا، پانی کے اندر ہی ہم نے اس کی خوب مرمت کی جیسا کہ ہاکی وڈ کی پکچروں میں ہوتا ہے۔ ہی...... ہی...... ہی......!!! بڑا سٹپٹایا بیچارہ! بھاگ گیا فوراً۔ مجھے ترس آ گیا، میں نے کہا اب لڑکوں کو بھی نہانے دو، سب لڑکیوں نے مجھ سے اتفاق کیا، ہم نے آوازیں دے کر سب کو اندر بلا لیا اور ہم خوب نہائے، گرم چشمہ میں نہانا بھی ایک مزیدار تجربہ ہے۔ آپ نے کبھی ایسے چشمہ میں باتھ کیا ہے؟

مگر بھگوان تو بھکشوؤں، بھکشونیوں اور مٹھوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اوشا کے سوال پر وہ ایکبار پھر چونک پڑے، "آں! کیا فرمایا آپ نے؟"

"آپ نے کسی گرم چشمے میں باتھ تو کیا ہوگا" اوشا نے پھر کہا

"نہیں مجھے اتفاق نہیں ہوا" بھگوان بولے

"بڑا خوبصورت تجربہ ہے" اوشا کہنے لگی "سنا تم! مارولیس!! کبھی ہمارے ساتھ مکھی پور چلیے نا"

اور ایک لمحہ کیلئے بھگوان کو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنے سبھی پچھلے تجربوں کو غلط کر دینا چاہتے ہوں، جیسے مملوط بیٹھوں کے بارے میں انھوں نے آنند کی بات مان لی ہو گرم چشمہ کے غسل کے تصور سے ان کے جسم میں تجسس اور مسرت کی لہر سی دوڑ گئی۔ مگر بھگوان بدھ کا گیان نشٹ کرنا مینکا کی قسمت میں نہ لکھا تھا وہ سنبھلے۔

"نہیں نہیں مجھے دفتر کے کام سے فرصت ہی کب ملتی ہے! صرف چھ آدمی اور اتنا کام! لیکن تم کبھی گول گنج آنے کا پروگرام ضرور بنانا"

اور بھگوان سوچ رہے تھے اوشا کتنی سندر ہے! اس کے مکھ کی لالی آشا کی پرتیک ہے! بہت سندر ہے وہ! تربینی پر ڈوبتے سورج سے بھی زیادہ سندر ہے وہ!!!

رات کو گھر لوٹا تو پتا جی کھانا کھا لینے کے بعد چولہے کے ٹھنڈے کوئلوں پر پاؤں سینکنے کی کوشش کر رہے تھے، میں، چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"پتا جی! جب تک آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہوتی کیوں نہ کسی ہوٹل پر کھانا کھایا کریں"

"تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو" انھوں نے کوئلوں پر پھونک لگا کر کہا "اب میں بیمار ہوں پھر تم بھی چارپائی پر پڑ جاؤ گے ہوٹل کی روٹیوں سے تمھیں واسطہ نہیں پڑا شاید"

میں چپ ہو رہا، پتا جی سوئے کوئلوں پر پھونکیں مار کر انھیں جگانے کی کوشش کرتے رہے، پھر میں نے کہا "آج اوشا ملی تھی، وہی آپکے مترپریاجی کی لڑکی"

پتا جی نے کچا پاپڑ ہی تھالی میں رکھ دیا اور بولے "اسے گھر لے آتے کیسی لگتی ہے اب وہ"

"اب تو وہ بہت بڑی ہو گئی!" میں نے کہا "تھرڈ ایر میں پڑھتی ہے شام کو تربینی پر گھومنے آئی تھی"

پتا جی تھالی میں روٹی پروسنے لگے، کچھ دنوں سے ان کی آنتوں میں ریح کا غلبہ ہو جایا کرتا تھا، ڈاکٹروں کی دوائیوں پر انھیں بھروسہ نہ تھا خود ہی جوشاندے بنا کر پیتے اور جب بھی درد سے فرصت ملتی میرے لئے اچھا سا کھانا تیار کر دیتے،

تھالی میری طرف بڑھاتے ہوئے انھوں نے پھر کہا "تم اسے گھر پر کیوں نہ لے آئے؟"

"فضول ہے" میں نے کہا "مجھے تو اس کی باتیں قطعاً پسند نہیں، ہر بات میں مغربیت کا رنگ دینے کی کوشش کرتی ہے"

"میں تو کئی بار اس کے ساتھ تمہاری شادی کے بارے میں سوچ چکا ہوں"

"شادی!؟" بھگوان بدے جیسے چارپائی سے گرتے گرتے بچے سنبھلے "اوراوشا کے ساتھ"

"آخر برا کیا ہے؟" پتاجی نے جھلا کر کہا

"مجھے یہ مغربی تتلیاں بالکل پسند نہیں" بھگوان بولے۔ ان کے تصوّر میں اوشا کے ابھرے گالوں پر شفق کا ابر تو جھلک رہا تھا "اور پھر پتاجی، کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگا تیلی! پرجاپتی گورنمنٹ کنزیکٹر کسی بڑے افسر کو تلاش کرے گا مجھ سے اس نے کیا لینا ہے!"

"وہ دن لد گئے" پتاجی کہنے لگے "شاید تم نہیں جانتے، پرجا آج کوڑی کوڑی کو محتاج ہے۔ ایک دو ٹھیکوں میں جمع جتھا برابر ہو گئی، لڑکے آوارہ، اوباش! میں تو حیران ہوں، لڑکی کی تعلیم کا خرچ کیسے چلتا ہوگا، کالج کی پڑھائی بہت مہنگی ہے آجکل"

اور بھگوان اوشا کے ان دوستوں کے بارے میں سوچنے لگے جو اس کے تعلیمی مصارف کا بار اپنے اوپر لے کر بہت خوشی محسوس کرتے ہوں گے، شام کو اس کے ساتھ کسی ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوں گے، پھر باہر گھومتے ہوں گے پھر سینما دیکھتے ہوں گے، پھر ......

"سوچ لو" پتاجی کہنے لگے "بھئی مجھے تو لڑکی پسند ہے"

اور بھگوان سوچنے لگے اوپر دل کے اندر اوشا کا جو روپ ہے وہ کتنا ستیہ ہے! سفید لباس میں ملبوس آسمان کی خوبصورت بیٹی، جس کے رخساروں پر سرخی تلاطم لے رہی ہے، وہ سرخی جو آشا کی پرتیک ہے، اوشا جس سے شادی کرے گی، اس کی زندگی میں حسن اور امید بھر دے گی ....

.... اور ساری رات بھگوان اپنے تصوّر کی آگ میں سلگتے رہے

ایک ہفتہ بعد ایکبار وہ بازار میں نکلے تو انھیں وہی نوجوان ملا، جو انھوں نے اوشا کے ساتھ ترینی پر دیکھا چہروں کے بارے میں بھگوان کا حافظہ کمزور واقع ہوا تھا، مگر اس نوجوان کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔

"ہلو!" بھگوان نے پکارا "کیسے ہیں آپ؟"

"ہلو!" وہ مسکرایا۔

"کہو اوشا جی کہاں ہیں؟" بھگوان نے دوسرا سوال کیا۔

"جہنم میں" اس نے جواب دیا

"کہاں؟" شاید اپنی نیم خوابی حالت میں بھگوان نے کسی ریستوران کا نام سنا تھا، جہاں اوشا اپنے دوستوں کے

کے ساتھ کھانا کھاتی تھی، پھر وہ گھومنے جاتے تھے، پھر سنیما دیکھنے پھر..... لیکن وہ سنبھلے "کہاں فرمایا، آپ نے!"

"نریش کے ساتھ بھاگ گئی" وہ کہنے لگا۔ "اوشا آپ کی کیا لگتی ہے؟"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں!!" بھگوان نے بمشکل کہا "یونہی بس سوشل ریلیشنز"۔ "دراصل بات یہ ہے کہ ان کے اور میرے پتا جی میں بڑی مترتا ہے"

"بڑی ظالم لڑکی ہے" نوجوان نے دائیں آنکھ کو ذرا سے دبا کر مسکرانے کی کوشش کی۔ "ایک تیر سے کئی شکار کرتی ہے، خاصی ڈپلومیٹ ہے"

یہ کہہ کر اس نے نمسکار کیا اور چلا گیا اور بھگوان کے تصور میں ایک کمسن لڑکی کی تصویر گھوم گئی، خوبصورت ہاف کوٹ پہنے وہ ایک کوٹھی کے احاطہ میں دوسرے بچوں کے ساتھ ناچ رہی تھی، اپنی انگلیوں کے درمیان ایک خوش رنگ تیتری دبائے، پھر باہر سے کسی بارات کے باجوں کی آواز آنے لگی، لڑکی نے تیتری زمین پر پٹک دی اور سڑک کی طرف بھاگی

اور بھگوان دفتر کی طرف چل دیے وہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ دفتر کا دروازہ بند تھا، پرے ایک چھوٹے کمرے میں چپراسی چائے کے لیے آگ جلا رہا تھا، بھگوان کو چپراسی کی اس تساہل پسندی پر بہت غصہ آیا، اچانک انھوں نے بنک کے باہر لگے دیواری کلاک کی طرف دیکھا، اور پھر اپنی گھڑی کی طرف، اور انھیں یاد آگیا کہ وہ تو بازار میں سبزی لینے نکلے تھے

اور بھگوان بازار کی طرف چل دیے ....

کئی سال بیت گئے پتا جی اس محفل سے رخصت ہو چکے تھے، اب مجھے ایک اچھے بنک میں ملازمت مل گئی تھی کھانا بنانے کے لیے پتا جی کی جگہ ایک عورت لے لی تھی جو اصطلاحی طور پر میری رفیق حیات کہلاتی تھی، میں اسے دروپدی کے نام سے پکارتا تھا، متوسط طبقہ کی ایک معصوم عورت جس کا بچپن ایک مختصر آبادی والے گاؤں میں گزرا تھا، جس کے لیے الہ آباد کی طویل گلیاں بازاروں میں آمد و رفت کی ہما ہمی ریلوے اسٹیشنوں پر مسافروں کی چہل پہل تین بچے اڑھائی سو روپیہ ماہوار اور مناسب خط و خال، والا خاوند ایک بڑی نعمت تھی، سارا دن گھر کے کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال کے بعد جو وقت ملتا تو رام چرن مانس کا پاٹھ شروع کر دیتی، بچوں کو سمجھاتی کر ایک مثالی دوست، ایک مثالی بیٹے اور ایک مثالی بھائی کے کیا اوصاف ہوتے ہیں، رام کی زندگی کی مثالیں دے کر وہ دنیا کا بڑے سے بڑا جھگڑا چکا سکتی تھی۔ کبھی سنیما کا پروگرام بنتا تو پہلے یہ پوچھ لیتی کہ کچھ دھارمک ہے یا

سماجک، سماجی فلموں کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ سماجی مسائل کو حل کرنے کی بجائے فحاشی کا پروپیگنڈا کرتی ہیں۔ کبھی ایسی فلموں کو دیکھ کر آتے تو کئی دن وہ اس کے جنسی اپیل کے منظروں کا ذکر کرکے کانوں پر ہاتھ دھرتی اور پھر توبہ کرتی کہ آئندہ دھارمک کے علاوہ اور کوئی پکچر نہ دیکھے گی۔ لیکن دھارمک پکچروں کے ایسے مناظر کے بارے میں خاموشی برتتی تھی کبھی میں چھیڑ دیتا تو کہتی دھرم کی ہر بات میں ایک رہسیہ ہوتا ہے۔ میں یہ منطق سن کر چپ ہو رہتا تھا۔

ہمارے پڑوس میں ایک مندر تھا، جہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی سادھو مہاراج براجمان رہا کرتے تھے محلہ کی عورتیں ان کے سامنے چاول، پھل، کپڑا، بادام سبھی چیزوں کا ڈھیر لگائے رکھتی تھیں، دروپدی بھی کبھی کبھی ان کے درشنوں کے لئے چلی جاتی، سادھو مہاراج گیتا کا پاٹھ کرتے، پھر کیرتن ہوتا، ڈھول، کرتال اور ہارمونیم کے ساتھ تالیاں بجتیں، بھگت لوگ اپنی اونچی اونچی آوازوں سے سورگ کے سوئے بھگوان کو جگانے کی کوشش کرتے اور پڑوس کے تھکے ماندے لوگوں کو سونے نہ دیتے۔

ایک دن میں نے کہا "بھگتوں کی چیخ پکار مجھے بالکل پسند نہیں، رات بارہ بجے سے پہلے کوئی آدمی سو ہی نہیں سکتا"

"آدھی زندگی تو ہم سو کر گزار دیتے ہیں" دروپدی نے اپنا دیاکھیان شروع کیا "بھگوان کا نام بھی تو لینا چاہئے نش جیون بار بار نہیں ملتا"

"لیکن نش جیون کیا اسی لئے ملتا ہے کہ پڑوسیوں کی نیند حرام کر دی جائے؟"

"دھنیہ ہیں وہ کان" دروپدی آنکھیں بند کرکے بولی جن میں یہ امرت بانی پہنچتی ہے"

"ممکن ہے پڑوس کا کوئی آدمی بیمار ہو" میں نے ریڈیو سے سنا فقرہ دہرا دیا "یا کوئی امتحان کے لئے تیاری کر رہا ہو، مگر بھگت لوگ اپنی ٹھائیں ٹھائیں سے باز نہیں آئیں گے"

"رام! رام!!" دروپدی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "ایسی باتیں منہ سے نہ نکالئے، اگر آپ بھگوان کا سمرن نہیں کرتے تو دوسروں کو بھی کیوں ٹوکتے ہیں، یہ تو بڑا دوش ہوتا ہے"

"بھگوان کا سمرن کوئی بری بات نہیں" میں نے کہا "لیکن شردھا تو نجی چیز ہے، ایکانت میں بیٹھ کر بھجن کرنا چاہئے، ڈھنڈورہ پیٹنے سے کیا لابھ؟"

"ایکانت میں بھگوان سمرن اپنی جگہ ٹھیک ہے" دروپدی نے اپنے تھیلے سے دوسری دلیل نکال لی "پرنتو سنت جنوں کی سنگت بھی تو کوئی چیز ہے۔ بنو ستسنگ ریویک ہوئی رام کرپا بن سلبھ نہ سوئی، آپ

ایک بار درشن تو کیجئے، کوئی کوئی پاپ دھل جائیں گے"

لگے روز بنک میں ایک مقامی چھٹی تھی، چنانچہ اپنے کوئی کوئی پاپ دھلوانے کے لئے میں سادھو مہاراج کی ڈنڈری میں چلا گیا، مندر کے وسیع احاطہ میں بھگتوں نے بے شمار برقی پنکھے لگا رکھے تھے، عورتوں، مردوں اور بچوں کا خاصہ ہجوم جمع تھا، درمیان میں ایک سنگھاسن پر سادھو مہاراج جلوہ افروز تھے، عمر تیس پینتیس کے درمیان، گول، گورا چہرہ گھنی داڑھی، لمبی لمبی زلفیں جن پر انھوں نے ایک تیز سی خوشبو لگا رہی تھی، آنکھوں پہ رنگین چشمہ حالانکہ دھوپ ان سے بہت دور تھی، سنگھاسن پر ایک پھولدار قالین بچھا تھا، آس پاس، پھلوں اور بادام کے تھال سجے تھے، پیچھے ان کے چیلے باادب ایستادہ تھے، جاگوت کا پاٹھ ہو رہا تھا، اس کے بعد وہی کیرتن شروع ہوا۔ بھگت لوگ ایک عجیب خود فراموشی کے عالم میں ڈھول اور کرتالیں بجا رہے تھے۔ ہارمونیم بجانے والے صاحب کی گردن کبھی ایک طرف گر جاتی تھی اور کبھی دوسری طرف مگر وہ باجا بجائے جا رہے تھے۔ ہجوم "جے گوپال"، "جے گوبند" کے نعرے لگا رہا تھا۔

میں نے سادھو مہاراج کے چرن چھوئے اور ان کے پاس دری پر بیٹھ کر بھگتی اور پریم کا نظارہ کرنے لگا۔

اچانک اگلی صف سے ایک عورت اٹھی اور ناچنے لگی، بھگت لوگ ذرا پیچھے کو کھسک گئے تاکہ اس کے رقص میں رکاوٹ نہ ہو، عجب وارفتگی کا عالم تھا سبھی تحسین کی نگاہوں سے رقاصہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایکبار وہ پلٹی تو میں نے اسے فوراً پہچان لیا، وہ اوشا ہی تھی، وہی گول اور سفید چہرہ جس کی سرخی آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی، بال روکھے، ہونٹوں پر لپ اسٹک کی بھرمار، میری نگاہوں کے :......... سامنے ایک کمسن لڑکی کی تصویر گھومنے لگی جو تیس برس پہلے لکھنؤ کی ایک کوٹھی کے احاطہ میں گل مہر کی کیاریوں کے درمیان ناچ رہی تھی، سرخ رنگ کا ہاف شرٹ پہنے.........

.........اور اوشا رقص کرتی رہی، رقص کرتی رہی، پھر ہارمونیم والے صاحب نے ایک لمبی سر لگائی، ڈھول اور کرتالیں خاموش ہو گئیں اور کیرتن ختم ہوا۔ بھگت لوگ سادھو مہاراج کے چرن چھونے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے، کچھ لوگ وہیں کھڑے رہے، اوشا ان میں ایک تھی۔

"ہلو، اوشا" میں نے آگے بڑھ کر کہا "کہو، کیسی ہو"

اس نے لاپروائی سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر کہنے لگی "میرا ناچ پسند آیا، تمھیں"

"بھئی، بہت خوب تھا" میں نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا "تم نے تو سماں باندھ کے رکھ دیا، میں پتھر کی مورت بنا دیکھتا رہا"

"تعریف کے لئے دھنیہ واد!" ادشا نے پیشہ ور رقاصہ کی طرح تسلیم عرض کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ بھگوان کا دھندا کب سے شروع کیا؟" میں نے پوچھ ہی لیا۔

"بھگوان، دھندا نہیں" ادشا تنک کر بولی، بھگوان تو شردھا ہیں، بھگوان تو انوبھو ہیں، جیون کا سب سے بڑا انوبھو!!، مگر تم جیسے ناستک کیا جانیں"

"میں ناستک نہیں ہوں اوشا!" میں نے کہا "میں کبھی ناستک نہیں تھا، لیکن میں زندگی کو پہلے مانتا ہوں، بھگوان کو بعد میں یا...... یا یوں کہہ لو میں...... بھگوان کو بہت کم مانتا ہوں"

"یہی تو میں کہتی ہوں" ادشا کہنے لگی "پہلے بھگوان کو مانو پھر زندگی خود بخود ٹھیک ہو جائے گی"

"کہاں رہتی ہو تم"؟ میں نے بات پلٹ دی "کبھی دروپدی کے ساتھ تمہارے ہاں آؤں گا"

"دروپدی کون ہے؟"

"میری پتنی۔"

"او اوہ!" وہ مسکرائی "لیکن تم میرے گھر آ کر کیا لوگے"، اس کے چہرے کی رہی سہی چمک بھی بجھ گئی، "وہ گھر نہیں۔ نرک ہے نرک، جس گھر میں روگ ہو وہ نرک کنڈ ہوتا ہے"

"روگ! نرک!!" میں چونکا "میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا"

"آ جائے گا" ادشا نے کہا "چلو چلیں میں یہاں سے بہت دور نہیں ہوں"

"اوشا نے جلدی سے سادھو مہاراج سے رخصت لی اور ہم چلے، وہ آگے تھی میں پیچھے، وہ بہت تیز جا رہی تھی اور اس کے ساتھ اتنا تیز چلنا کبھی کبھی مجھے بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا، کئی گلیاں اور بازار گزرنے کے بعد وہ ایک مکان کے سامنے رک گئی، اور جیب سے چابیاں نکال کر تالا کھولا ہم اندر داخل ہوئے۔

"آ گئی، اوشا!" کسی نے اندر سے پکارا

"ہاں، آ گئی!!" اوشا نے کڑک کر کہا "میرا آنا بھی برا لگتا ہے کیا؟"

میں حیران تھا بند مکان کے اندر سے کون بول رہا ہے، میں روشنی میں تھا کمرے میں اندھیرا تھا، اس لئے مجھے اندر کی چیزیں صاف طور سے دکھائی نہیں دے رہی تھیں، ڈیوڑھی کے پیچھے صحن تھا جس کا دروازہ کھلا تھا اور صحن کے عقب میں دو اور کمرے، اوشا فوراً اندر کے ایک کمرے میں چلی گئی، میں اندر اور باہر کے کمرے کے درمیان لٹکتا رہا، پھر میں نے ڈیوڑھی سے ملحقہ کمرہ میں جھانک کر دیکھا، تو وہاں کوئی صاحب چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے، پاس دو کرسیاں پڑی تھیں۔

میں تو کتنی دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں" وہ پھر بولے۔ مگر اوشا نے یہ آواز نہ سنی "یہ تمہارے ساتھ کون ہے"
"میں...... میں...... میں اوشا کا بھائی ہوں" میں نے یہی کہنا مناسب سمجھا۔
"ارے! ہرشے ناتھ!" وہ بغیر گردن ہلائے کہنے لگے "تم کب آئے بھائی"
"میں ہرشے ناتھ نہیں ہوں" میں نے جواب دیا "میں اوم پرکاش ہوں"
"تم ابھی یہاں کھڑے ہو؟!" اوشا نے عقبی کمرے سے نکلتے ہوئے کہا "میں ابھی آتی ہوں" اور وہ دیوڑھی سے نکل کر تیزی سے گلی میں چلی گئی، میں دُبدھا میں وہیں کھڑا رہا۔
اندر سے پھر آواز آئی، "اندر چلے آیئے" میں اندر چلا گیا۔
ایک مختصر سا چوکور کمرہ، دیواروں پر پرانی وضع کی تصویریں ٹنگی ہی تھیں، دیوار پر ایک کلاک بھی تھا ایک کونے میں گندے کپڑوں کا ڈھیر تھا، دوسرے میں ایک چارپائی جس پر وہ صاحب لیٹے ہوئے تھے، پلنگ کے پیچھے دیوار میں ایک الماری تھی، جس کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اس کے ایک خانے میں کچھ کتابیں تھیں، اور دوسرے میں شیشیاں، چارپائی کے پاس دو کرسیاں پڑی تھیں۔ انھوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا، میں بیٹھ گیا۔
"میں ڈلہوزی بنک کا منیجر ہوں" میں نے اپنا تعارف کرایا "بچپن میں اوشا کے ساتھ کھیلا ہوں، ہمارے پتا ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے اور آپ!"
"اور میں! انھوں نے ایک قہقہہ لگایا "میں ایک لاش ہوں جس کو جلا دینا شاید قانون کی نگاہوں میں جرم ہے" ان کا انداز فلمی تھا "پچھلے چھ سالوں سے دونوں ٹانگیں بالکل مفلوج ہو چکی ہیں، فالج نہ مجھے چھوڑتا ہے نہ لیتا ہے، ہر لمحہ موت کا منتظر ہوں"
"بھگوان کی دیا کا انتظار کیجئے" میں نے کہا، کیونکہ ایسے موقعوں پر یہی کہا جاتا ہے "ان کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں"
"لیکن میری تو ان کے گھر میں رسائی نہیں" وہ مسکرائے "وہاں تو اوشا ہی جا سکتی ہے"
میں خاموش رہا، دیوار پر لگا کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا۔
"لیکن آپ کو یہ بیماری ہوئی کیسے؟" خاموشی مجھے ناگوار گزر رہی تھی!
"یہ ایک لمبی کہانی ہے" ان کا انداز پھر فلمی تھا "بس یوں سمجھ لیجئے کہ کرنی بھرنی کا قصہ ہے" وہ کچھ لمحے خاموش رہے پھر بولے "اوم پرکاش صاحب! سول میرج کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"
"میں نے کبھی غور نہیں کیا اس بارے میں" بھگوان نے جواب دیا، وہ اس موضوع سے بھاگنا چاہتے تھے

"لیکن اگر میں غلطی نہیں کرتا" "نہیں جیسے بھوسے کے ڈھیر سے سوئی مل گئی تھی" "آپ کا شبھ نام رشیں......"

"ہاں جی میرا نام ہے" وہ کہنے لگے، پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے "میں سمجھتا ہوں سول میرج ان بے شمار نقوں میں سے ہے جو ہم نے مغرب سے مستعار لی ہیں"

"لیکن میں سمجھتا ہوں" بھگوان نے اختلاف ظاہر کرنے کی جرأت کی، "سول میرج ہمارے دیش کے لئے کوئی نئی چیز نہیں پرانے وقتوں لوگ اسے ہی گندھرب دواہ کہا کرتے تھے"

وہ پھر خاموش ہو گئے، دیوار پر لگا کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا۔

پھر وہ کہنے لگے، میں سمجھتا ہوں، اوشا آپ کے مشورہ کو کبھی ٹال نہیں سکتی، بچپن کی ملاقات جو ٹھہری" وہ مسکرائے "اگر ہو سکے تو آپ اسے یہ صلاح دیجئے کہ وہ کاشی نہ جائے"

"جی!!" بھگوان چونک پڑے "اوشا کاشی جا رہی ہے کیا؟"

"ہاں!" انھوں نے ماتھا سکوڑے ہوئے کروٹ لینے کی کوشش کی "سنا ہے گول گنج کے پاس ایک مندر میں کوئی سنت جی آئے ہوئے ہیں اسکول میں چھٹیاں ہیں نا، اسلئے سارا دن مندر میں ہی رہتی ہے، اب ایک پڑوسن نے مجھے بتایا ہے کہ وہ سنت جی کے ساتھ کاشی جا رہی ہے، ادھر میں موت اور زندگی کے درمیان لٹک رہا ہوں، اس حالت میں اوشا کا، کاشی جانا ٹھیک ہے کیا؟ دیکھئے نا........"

مگر ان کا فقرہ ادھورا ہی رہا۔ اسی اثنا اوشا نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا اور اسے دیکھتے ہی وہ ہم خاموش ہو گئے

"پرکاش، اندر ہو کیا؟" اس نے مجھے پکارا

"ادھر آجاؤ آپ" اس نے صحن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر وہ لپک کر اندر چلی گئی۔ اس کے ہاتھ میں دو لفافے تھے، میں نے ایک نظر اس کے دائم المرض خاوند کو دیکھا، پھر اس سے کچھ کہے سنے بغیر صحن کی طرف چلا گیا۔

اندر کے ایک کمرہ میں رسوئی تھی، دوسرا خوبصورت فرنیچر سے سجا ہوا تھا، فرش پر ایک بوقلموں جاجم بچھا تھا اس کے اوپر بید کا خوبصورت صوفہ سیٹ ایک مدور میز کو اپنے درمیان لیے جیسے کسی مہمان کے لئے چشم براہ تھا، میز پر ایک انگریزی رسالہ، سگریٹ کیس اور ایش ٹرے پڑی تھی، مینٹل پیس پر پڑی اوشا کی تصویر کے دونوں طرف خوبصورت کھلونے آراستہ تھے، دوسری دیوار کے ساتھ پلنگ بچھا تھا، کونے میں ڈریسنگ ٹیبل تھی، اس کے اوپر بجلی کا بلب شاید ہر وقت روشن رہتا تھا۔

اوشا نے الماری سے ایک بڑی پلیٹ نکالی اور لفافوں کی مٹھائی اس میں انڈیل دی، میں نے کھڑے کھڑے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینہ میں تین بار اپنا چہرہ دیکھا، اوشا نے بیٹھنے کا اشارہ کیا، میں بید کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ارے ارے!! ادھر نہیں، یہاں بیٹھو" اوشا نے صوفہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں کرسی سے اٹھ کر صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اوشا بھی میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی اور پلیٹ سے ایک بالوشاہی نکال کر بولی "تم بھی لو نا"

میں نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال لیا اور ایکبار پھر کمرہ کی چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں میرے پتی دیو سے؟" اس نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔

مگر پیشتر اس کے کہ میں جواب دیتا، اندر سے پھر آواز آئی "اوشا!"

"پھر وہی کمبختی!" اوشا نے جلدی سے بالوشاہی نگلتے ہوئے کہا، وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور پھر جلد ہی صحن میں واپس آکر نلکا چلانے لگی۔

میں نے ایک گلاب جامن اٹھا کر منہ میں ڈال لیا

"پانی! پانی!! پانی!!!" باہر صحن میں اوشا چلا رہی تھی اور بڑی تیزی سے نلکے سے پانی نکال رہی تھی "جب دیکھو اسے پیاس لگی رہتی ہے، نلکا اکھاڑ کر تمھارے کمرے میں نہ لگا دوں!! پھر جی بھر کر پانی پی لینا"

اور بھگوان کو ایسے لگا جیسے گلاب جامن کا ذائقہ ایک دم کڑوا ہو گیا تھا اور اس سے ناقابل برداشت بدبو آنے لگی تھی۔ انھوں نے اسے فرش پر تھوک دیا اور رومال سے منہ صاف کرنے لگے، پانی کا لوٹا اپنے خاوند کو دینے کے بعد اوشا تیزی سے اندر کے کمرے میں آگئی۔

"میں نے کہا تھا نا، نرک ہے نرک میرا گھر" وہ اپنے خاوند کو سنا کر بھگوان سے کہنے لگی "دیکھ لیا تم نے!" وہ صوفہ پر گر پڑی اور ہانپنے لگی۔

"کٹھور نہ بنو اوشا" بھگوان کہنے لگے، "روگی کی سیوا کرنا تمھارا کرتویہ ہے اور پھر وہ تمھارا پتی ہے"

"پتی! پتی!! پتی!!!" اوشا نے اسی جھلاہٹ سے جواب دیا "اس کے ساتھ شادی کر کے میں نے تو اپنی زندگی تباہ کر لی ہے" وہ دوسرا بالوشاہی کھانے لگی۔ "تم بھی کھاؤ نا"

"بس بہت کھا چکا" بھگوان نے کہا۔

"واہ! کیا کھا لیا تم نے؟ مٹھائی تو ساری یونہی پڑی ہے" اس نے ایک بالوشاہی بھگوان کے منہ میں ٹھونس دیا، مگر یہ بالوشاہی کڑوا نہ تھا اور اس سے الائچی اور کیوڑہ کی خوشبو آ رہی تھی

بھگوان جگالی کرنے لگے

"ایک بار بھگوان بدھ کے پاس ایک دیشیا آئی" وہ اپنے پچھلے جنم کا ایک قصہ سنانے لگے" بھگوان نے کہا دیوی ابھی تم سے ملاقات کا وقت نہیں آیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہ دیشیا کوڑھی ہو گئی اور راستے کے گرد و غبار پر پڑی رہی

بھگوان وہیں پہنچے اور کہنے لگے ۔دیوی! اب وقت آگیا ہے اور میں بھی آگیا ہوں"
"یہ کویتا، انٹرمیڈیٹ میں پڑھی تھی"
"میں نے بھی انٹرمیڈیٹ میں ہی پڑھی تھی" بھگوان بولے "پر تو اس کویتا سے تم نے کیا لیا؟" انھوں نے ایک امرتی پلیٹ سے اٹھائی
"لینا کیا تھا!" وہ بولی "پڑھی تھی بس"
"کاش! تم اس کویتا کو اپنے جیون میں سمو سکتیں" بھگوان کہنے لگے "یہ کویتا تمہارے جیون کو کویتا بنا دیتی اس میں سنگیت بھر دیتی"
"تم نہیں سمجھ سکوگے" ادشا نے اپنی باہیں بھگوان کے گلے میں ڈال دیں، "یہ گھر میرے لئے نرک ہے نرک، سنت باباکے چرنوں میں جو سمے بیت جاتا ہے اسی کو دھنیہ سمجھتی ہوں" وہ صوفہ سے اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی، "بہت تھک گئی ہوں"
"ایک بات مانوگی" بھگوان نے پوچھا
"کہو"... وہ پلنگ پر لیٹ گئی اور بھگوان کی طرف منہ کرکے کروٹ لے لی۔
"بہت دھیرے بولو، بہت دھیرے چلو اور بہت دھیرے سوچو" بھگوان نے مشورہ دیا۔
"اور اپنے پتی کے پاس بیٹھ کر دھیرے دھیرے پنکھا ہلاتی رہو" اس کے لہجہ میں طنز تھا اور لبوں پر زہریلی مسکراہٹ "اف! کتنی گرمی ہے!" وہ کھجور کا ایک پنکھا ہلانے لگی
"ہر بات پر وچار کرنا منش کا کرتویہ ہے" بھگوان پھر کہنے لگے "اور اگر وہ اچھی ہو تو اسے گرہن کرنا اس کا دوسرا کرتویہ ہے"
"کرتویہ اکرتویہ کرتویہ!!" ادشا پھر چلانے لگی "زندگی نہ ہوئی کرتویوں کی ایک گٹھری ہو گئی، ادھر لیٹ جاؤں تو اُدھر آجاؤں تو مجھے کروٹ لینی پڑتی ہے"
"نہیں اب چلتا ہوں" بھگوان اٹھ کھڑے ہوئے، کیونکہ ابھی اس عورت سے ملاقات کا وقت نہیں آیا تھا،
"ارے واہ! وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی "آئے بھی اور چل بھی دیئے" اس نے بھگوان کا ہاتھ پکڑ لیا
اچانک اس کا دھیان باہر کی طرف گیا کوئی بے تحاشہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا، ادشا تیزی سے باہر نکل گئی اور پھر کچھ دیر بعد ایک تلک دھاری مہاتما کو لئے اندر آگئی۔
"بہت آوازیں دیں آپ کو" مہاتما جی نے بھگوان کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "آپ

نے سامان باندھ لیا؟"

"ارے! تو کیا آج ہی جانے کا پروگرام ہے؟" اوشا نے حیرت اور مسرت سے پوچھا

"ہاں!" وہ بولے۔ "بابا بولتے ہیں، اوشا بہن سے کہو کہ وہ جلدی سے اپنا سامان لے کر آجائیں، ساڑھے چھ بجے ریل چھوٹتی ہے"

اور اوشا جلدی جلدی اٹیچی کیس میں کپڑے ٹھونسنے لگی۔ تین ساڑھیاں، پانچ جمپر، سنگار بکس، دو بریسیئر

"اچھا میں چلتا ہوں!" بھگوان نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "نمسکار"!

"ٹھہرو ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں گے" اوشا نے اٹیچی کیس بند کرتے ہوئے کہا "یہ میرے منہ بولے بھائی ہیں" وہ مہاتما جی سے کہہ رہی تھی۔

"پرنام" انھوں نے بھگوان کو پرنام کیا۔

بھگوان نے اپنا دایاں بازو اٹھایا: جیسے عجائب گھروں میں پڑے گاندھارا مدرسۂ فن کے اکثر بودھی مجسموں نے اٹھایا ہوتا ہے، اور تینوں ڈیوڑھی کی طرف بڑھے،

"تمھارے کھانے کے لئے میں نے پڑوسن سے کہہ دیا ہے"، اوشا نرک کنڈ میں جھانک کر بولی

اندر سے آواز آئی "جا رہی ہو کیا؟"

"لو ایک اور بدشگونی ہوئی" اوشا نے جھلا کر اٹیچی کیس فرش پر پٹک دیا، تیرتھ یاترا کے لئے جا رہی تھی پیچھے سے روگی نے آواز دے دی۔ ہاں بابا! جا رہی ہوں! جا رہی ہوں ..... جا..... رہی..... ہوں سن لیا تم نے؟ اور ایک مہینے کے بعد تمھارے پاس پھر اس نرک میں آجاؤں گی"

اس نے اٹیچی کیس اٹھایا اور کولھے مٹکاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"آپ کبھی کبھی آیا کیجئے، پرکاش بھائی!"

"یہ تو آئیں گے ہی" اوشا نے گلی میں کھڑے کھڑے پکارا انھیں روگیوں کی سیوا سے وشیش آنند ملتا ہے"

اور وہ مہاتما جی کے ساتھ بھاگ گئی۔

بھگوان بدھ گلی میں کھڑے تھے وہ نہ جانے کتنا عرصہ وہاں کھڑے رہے، اس دنیا کے بارے میں سوچتے ہوئے، جہاں دکھ ہی دکھ ہیں، وہ دکھ جو ہم نے خود پیدا کئے ہیں اور جن کی تخلیق میں ہم دن رات مصروف رہتے ہیں تاکہ زندگی میں خوبصورتی نہ پیدا ہوسکے، موسیقی نہ پیدا ہوسکے، نرمی اور تناسب پیدا ہوسکے، اور پھر انھیں ایسے لگا جیسے اوشا کوڑھی ہو گئی ہو اور راستے کے گرد و غبار پر بیٹھی ان کا انتظار کر رہی ہو،

اندر سے پھر آواز آئی "آپ تو کبھی کبھی میرے پاس آئیں گے نا؟"

مگر بھگوان نے وہ آواز نہ سنی۔ ایک مریض کی آواز جو مدد کے لئے انھیں پکار رہا تھا، اور ایک صحت مند عورت کے کوڑھ کے بارے میں سوچتے ہوئے گلی میں دہار کرنے لگے۔

مجنوں گورکھپوری

یاسؔ عظیم آبادی

یورپ کی پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے فوراً بعد اردو کے جن بڑے غزل گو شعرا نے شہرت پائی، ان میں عزیزؔ لکھنوی۔ یاسؔ عظیم آبادی، اور فانیؔ بدایونی وہ شخصیتیں ہیں جن کو میں نے علی الترتیب سب سے پہلے جانا، اور جن کی شاعری کو کسی نہ کسی اعتبار سے ترجیح پایا

یاسؔ عظیم آبادی کو میں نے نہ کبھی لکھنوی سمجھا اور نہ کبھی یگانہ تسلیم کیا۔ اور ان کے چنگیزی انداز سے میں ہمیشہ افسوس کے ساتھ چڑھتا رہا، ان سے میرا پہلا غائبانہ تعارف ۱۹۲۱ء میں لاہور کے رسالہ "ہمایوں" کے ذریعہ ہوا۔ "نگار" ابھی نہیں نکلا تھا، اور "مخزن"، "تمدن"، "صلائے عام" اور "نقاد" کے زوال کے بعد "ہمایوں" اردو کا پہلا رسالہ تھا، جس نے علم و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والوں کی امیدوں کو پورا کیا، اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا

یاسؔ کی جو غزل "ہمایوں" میں سب سے پہلے میری نظر سے گزری اس کا مطلع جہاں تک مجھے یاد ہے، یہ تھا:

جرس کے شور سے دل کا یہ حال ہوتا ہے
شہید جیسے کوئی پائمال ہوتا ہے

یہ مطلع خود اپنی جگہ اہل فکر و نظر کو چونکا دینے والا تھا۔ حسرتؔ سے عزیزؔ تک بہت سے چھوٹے بڑے غزل گو شعرا اس وقت میدان میں تھے۔ یاسؔ کی آواز ان سب کی آوازوں سے الگ اور ممتاز تھی اور آنکھیں بند کر کے شاعروں کے بھرے مجمع میں پہچانی جا سکتی تھی، یاسؔ نے اپنی اس نئی آواز کا بھرم ہمیشہ قائم رکھا، اس وقت بھی جب وہ یاسؔ سے بگڑ کر یگانہؔ ہو گئے۔

جو مطلع میں نے ابھی سنایا ہے، وہ ممکن ہے یاسؔ کے بہترین اشعار کے انتخاب میں جگہ نہ پا سکے، لیکن تاثر اور اظہار دونوں کے اعتبار ایک ایسا انداز لئے ہوئے ہے جو اردو کے کسی دوسرے شاعر کے انداز کے ساتھ مخلوط نہیں ہو سکتا، حالانکہ شعر میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کو شعرا روز اول سے استعمال کرتے نہ آئے ہوں۔ شعر یقیناً

ایک تاثر ہے مگر اس تاثر کی ترکیب میں ایک نیا عنصر شامل ہے جو تفکر کی علامت ہے، لہجہ سے پایا جاتا ہے کہ شاعر ایک شدید قوت ارادی کا بھی مالک ہے جس سے اس کے اندر اپنے کو سنبھالے رہنے کی تاب پیدا ہو گئی ہے اور وہ ایک معروضی بے تعلقی کے ساتھ خود اپنی حالت پر نظر ڈال سکتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شعر "آیات وجدانی" اور "گنجینہ" دونوں میں سے کسی میں بھی کیوں شامل نہیں کیا گیا

اس غزل کے کچھ اشعار جو اب تک مجھے یاد آتے رہتے ہیں یہ ہیں:

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا — عجیب شے یہ طلسم خیال ہوتا ہے

کتاب عمر ہے گویا انیسِ تنہائی — نظر میں نقشۂ ماضی وحال ہوتا ہے

خدا میں شک ہو تو ہو موت میں نہیں کوئی شک — مشاہدے میں کہیں احتمال ہوتا ہے

بہ قدر حوصلہ ملتی ہے دادِ عشق و ہوس — مزاجِ حسن میں کیا اعتدال ہوتا ہے

جب میری نظر سے یہ غزل گزری تو میں نے ایسا محسوس کیا کہ یہ پہلی آواز ہے جو اس رومانی آواز سے مختلف ہے جس سے اس وقت ساری اردو شاعری بالخصوص غزل گونج رہی تھی اور جس میں تھکا دینے والی یکسانی پیدا ہو چلی تھی۔ مجھے یاس زندگی کے مبصر معلوم ہوئے، وہ محض زندگی کے حالات و واردات کے شاعر نہیں بلکہ ان کی ماہیتوں کے شاعر ہیں، ان کے یہاں حسن و عشق کا بھی جب ذکر ہوتا ہے تو انفعالی انداز کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ ایک حکیمانہ ادراک کے ساتھ ہوتا ہے، وہ حسن و عشق کی اصلی فطرت سے ہم کو آگاہ کرتے ہیں۔ اور پھر ان کے یہاں عشق و حسن کا تصور زندگی کے کلی تصور سے الگ کوئی چیز نہیں۔

کچھ شماروں تک "ہمایوں" میں یاس کی غزلیں برابر چھپتی رہیں اور ہر غزل ہمارے لیے ایک مخصوص ممتاز کروار شعری کی حامل ہوتی تھی، بعض غزلوں کے کچھ اشعار اسی وقت سے میرے ذہن میں نقش ہیں

موج ہوا سے خاک اگر آشنا نہ ہو — دنیائے گرد و باد کی نشو و نما نہ ہو

اس شعر کا فکری میلان اور اس کے اظہار کا اسلوب دونوں عام غزلیاتی شاعری سے بہت الگ ہیں۔ شاعر کائنات کی تخلیقی اور ارتقائی رفتار کے بارے میں ایک بلیغ تصور رکھتا ہے، وہ فطرت کے تمام عناصر و اجزا اور مظاہر و حوادث کے درمیان ایک ناگزیر ازلی رشتہ محسوس کرتا ہے اور سارے موجودات کو کلی حیثیت سے ایک آہنگ پاتا ہے

اس غزل کا ایک دوسرا شعر یہ ہے

"کھلا پہرہ ہے کاتب اعمال ہوشیار — آمادۂ گناہ کوئی جا لگتا نہ ہو

اس شعر میں فکر اور دعوت نبرد کا جو ہے وہ بھی یاس کی اپنی خصوصیت ہے جو ان کی شخصیت اور شاعری سے

کبھی جدا نہیں ہوئی

ایک دوسری غزل کے جو اشعار یاد آرہے ہیں وہ یہ ہیں۔

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے تدبیر دیکھنا
منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا

مردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے اپنی موت
ہاں دیکھنا، ذرا فلک پیر دیکھنا

پہنا دیا ہے طوق غلامی تو ایک دن
میری طرف بھی مالک تقدیر دیکھنا

شاید خدانخواستہ آنکھیں دغا کریں
اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا

ان اشعار میں بھی زندگی کی وہی بصیرت، کامیابی اور ناکامی اور غم اور خوشی کی طرف سے وہی مفکرانہ بے نیازی، وہی انسانیت کا پندار، اپنے ارادہ اور ہمت کا وہی پُر اعتماد احساس زیرِ سطح تموج کے طور پر کارفرما ہے، جن کو ہم یاسؔ ہی سے مخصوص پاتے ہیں۔

آخری غزل جو مجھے "ہمایون" میں چھپی ہوئی یاد آرہی ہے اس کا مطلع یہ ہے، ٹھیک یاد نہیں کہ اس کے بعد یاسؔ کی کوئی غزل پھر "ہمایون" میں شائع ہوئی یا نہیں

ٹھوکریں کھلوائیں کیا کیا پائے بے زنجیر نے
گردش تقدیر نے جولانیٔ تدبیر نے

تقدیر اور تدبیر کے عام تصور سے یہ شعر ہٹا ہوا ہے، تمام کائنات کی تخلیق میں ایک پراسرار غیبی قوت جس کو تقدیر کہتے ہیں، حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جس کو کسی نہ کسی ہیئت میں کسی نہ کسی حد تک سبھی شعرا اور حکما تسلیم کرتے آئے ہیں، لیکن اہلِ فکر و بصیرت جانتے ہیں کہ اعلیٰ انواع مخلوقات، خاص کر انسان کی زندگی تنہا اس قوت کے ہاتھ میں نہیں ہے، اس کے جملہ حادثات و واردات کی تشکیل میں خود انسان کے ارادہ اور تدبیر کو بھی بہت بڑی حد تک دخل ہے، ہم ٹھوکریں کھاتے ہیں تو وہ تقدیر کا قصور نہیں ہے بلکہ دراصل ہمارا "پائے بے زنجیر" ہم کو ٹھوکریں کھلواتا ہے، کتنی خوش اسلوبی اور دل نشینی کے ساتھ ہم کو یہ راز سمجھایا گیا ہے کہ "گردش تقدیر" اور "جولانیٔ تدبیر" دو متضاد طاقتیں نہیں ہیں، یہیں سے یہ نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا کردار جب عمل میں اپنے کو ظاہر کرتا ہے تو اس کا مقدر بن جاتا ہے اور یہیں سے ہم کو یہ اشارہ ملتا ہے کہ زندگی کی حرکت مقدر پر فتح پا سکتی ہے۔

پھر عرصہ تک مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے کسی رسالہ میں یاسؔ کی کوئی غزل چھپی ہوئی دیکھی ہو، یاسؔ پرگو شاعر نہیں تھے، ان کے کل مجموعۂ کلام کی مختصر ضخامت اس بات کی شہادت ہے کہ وہ اس وقت تک شعر نہیں کہتے تھے، جب تک کوئی شدید تاثر یا کوئی نیا اور واضح تصور ان کے اندر شعر کہنے کی تحریک نہ پیدا

کرے۔ یاسؔ کے کلام کا انتخاب کرنا ذرا مشکل کام ہے اس لئے کہ ان کے یہاں بھرتی کے اشعار بہت کم نکلتے ہیں، یگانہ ہونے کے بعد بھی جبکہ انھوں نے زبان و بیان پر اپنی چنگیزی قدرت دکھانا شروع کی اور ان کے بہت سے اشعار لفظوں اور بندشوں کے استادانہ چٹخارے ہونے لگے، یاسؔ کے ہر شعر میں ایک انفرادی سطوت کا احساس تو پایا جاتا ہی ہے۔

یاسؔ کی طبیعت میں خودداری اور بے نیازی ضرورت سے زیادہ تھی، ابتدائی دور میں بھی کبھی کبھی شبہہ ہونے لگتا تھا کہ یہ بڑھی ہوئی خودداری اور احساسِ وقار کہیں کسی نفسیاتی گرہ (complex) یا اندرونی تصادم کا نتیجہ تو نہیں ہے، یاسؔ نہ صرف کم شعر کہتے تھے بلکہ وہ اپنے اشعار کی زبانی اور تحریری اشاعت کی طرف سے ضرورت سے زیادہ بے نیاز تھے۔ یہ میں اس وقت کی بات کر رہا ہوں جب کہ ان کا پہلا مجموعہ "نشترِ یاس" شائع ہوا تھا اور لکھنؤ کے تمام طوفانِ بے تمیزی کے باوجود وہ اپنے دور کا سارا انتقام غالب سے لینے پر نہیں اترے تھے، خود اپنا ڈفالی نہ ہونا تو بڑی معصومیت اور شرافت کی بات ہے اور شہرت کے پیچھے اپنے فطری ناموس اور عزتِ نفس کو گنوا دینا تیسرے درجے کی حرکت ہے، لیکن ایسی بھی آرزو کیا کہ یہ اعتماد ہوتے ہوئے بھی کہ آپ کی آواز آپ کے دور میں اپنے عنوان کی ایک نئی آواز ہے اور لوگ اس آواز کو سننا اور اس کے ارتعاشات کو اپنی آوازوں میں جذب کرنا چاہتے ہیں، آپ خواہ مخواہ ایک پندار و تبختر کے پردہ میں اپنی ہچکچاہٹ کو چھپا کر اپنی آواز سنانے سے ہمیشہ پہلو بچاتے ہیں۔

مشاعروں میں تو اول اول کشاں کشاں پہنچ بھی جاتے تھے یا پہنچا دئے جاتے تھے، خاص کر الٰہ آباد کے مشاعروں میں، جس زمانے کی یہ بات ہے، الٰہ آباد اربابِ علم و فن اور اصحابِ ذوق کا مرکز تھا اور جیسے ستھرے اور شاندار مشاعرے الٰہ آباد میں ہوا کرتے تھے کہیں اور نہیں ہوتے تھے، اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو، یاسؔ نے کھل کر اور اپنی ساری شخصیت کو ابھار کر کے اپنی بہترین غزلیں الٰہ آباد ہی کے مشاعروں اور نجی صحبتوں میں سنائی ہیں۔ ۱۹۴۲ء تک تو یاسؔ مشاعرے کے بہانے میرے بلائے ہوئے حیدرآباد سے گورکھپور چلے آئے اور پھر اس کے بعد ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے بھی کبھی کبھی ان کی آواز سننے میں آتی رہی، لیکن رسالوں میں ان کے کلام کی اشاعت اور بھی کم ہوتی رہی، اس سے یاسؔ کا ذاتی پندار جس قدر بھی آسودہ ہوا ہو، مگر اس سے ان کی شاعری کی بڑی حق تلفی ہوئی اور اردو شاعری کی نسل ان سے جو کچھ حاصل کر سکتی تھی اس میں ناقابلِ تلافی خسارہ ہوا، میں اشاروں میں ایک سے زائد بار اس خیال کا اظہار کر چکا ہوں کہ یاسؔ کی شاعری نوجوانوں کو ایک نئی طرز کا احساس و فکر اور ایک نیا عنوانِ اظہار دے سکتی ہے

جن غزلوں کا میں اس سے پہلے حوالہ دے چکا ہوں ان کے بعد جو شائع شدہ غزل میری نظر سے گزری وہ ان کی مشہور غزل تھی جو ۱۹۲۴ء میں الٰہ آباد میں پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن کے طرحی مشاعرے کے موقع پر پڑھی گئی تھی، جس کی صدارت سر تیج بہادر سپرو نے کی تھی۔ اس مشاعرے کی تمام غزلیں، گلشن صاحب نے ایک نہایت دیدہ زیب اور دلفریب زرین گلدستہ کی شکل میں اپنے صرفہ سے شائع کرائی تھیں۔ لیکن یاس کی غزل مشاعرے ہی سے ضرب المثل ہو کر مشہور ہو گئی تھی، غزل کا مطلع سنئے۔

قفس میں بوے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر — نویدِ ناگہاں پہنچی ہے مرگِ منتظر ہو کر

یاسؔ جب مشاعرہ میں پڑھتے تھے تو سارے مشاعرے پر چھا جاتے تھے، مجھے کوئی مشاعرہ یاد نہیں آتا جس میں یاسؔ نے بھر پور داد نہ پائی ہو۔ یہی نہیں جس مشاعرہ میں یاسؔ اپنا کلام سناتے تھے تو مشاعرہ برخاست ہونے کے بعد جس طرح لوگوں کی زبانوں پر یاسؔ کے اشعار ہوتے تھے دوسرے اساتذہ کے اشعار بہت کم ہوتے تھے۔ پھر بھی میں یاسؔ کو مشاعرہ کا شاعر نہیں سمجھتا تھا۔ ان کے اشعار ایسے ہوتے تھے کہ ان کو یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ پڑھا جائے اور ان پر تھم تھم کر غور کیا جائے اور ان کی تہ در تہ معنویت کو سمجھا جائے۔ اس لئے کہ یاس کے بہت کم اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں ہم کو زندگی کے متعلق نئی آگہیاں نہ ملتی ہوں اور جن سے ہمارے اندر تازہ توانائی اور تاب زندگی نہ پیدا ہوتی ہو، یاسؔ کے اشعار بغیر تفکر کے اچھی طرح نہیں سمجھے جا سکتے۔ جو شعر ابھی سنایا گیا ہے اس کی کائنات کا جائزہ لیجئے، استعارہ یہ ہے کہ ایک مرغ اسیر نہ جانے کب سے چمن سے دور قفس میں زندگی بسر کر رہا ہے اور وہ بیک وقت دو متضاد آرزوؤں کی کشاکش میں مبتلا ہے، ایک طرف تو اس کو یہ آرزو بے چین کئے ہوئے ہے کہ ایک بار اس کے چمن کی مخمور کر دینے والی مہک کسی طرح پھر اس تک پہنچ جاتی، دوسری طرف وہ قفس کی اذیتوں سے تنگ آ کر دعا کر رہا ہے کہ اس کی موت ہی آ جاتی اور وہ تمام آزار سے چھٹکارا پا جاتا۔ زندگی کا طنز دیکھئے کہ اس کی دونوں آرزوئیں پوری ہوتی ہیں اور ایک ہی وقت پوری ہوتی ہیں، وہ "بوے مستانہ" کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہے، اور اس انتظار میں اس کی موت کی آرزو اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ وہ چمن کی "بوے مستانہ" کی طرف سے بے نیازی کی حد تک مایوس ہو جاتا ہے ایسے میں "بوے مستانہ" "نویدِ ناگہاں" کے طور پر پہنچتی ہے مگر اب اس کی موت کی گھڑی بھی آ پہنچی ہے، گویا "بوے مستانہ" "نویدِ ناگہاں" بن کر اس کے لئے دردِ سر بن کر آتی ہے اور "نویدِ ناگہاں" اس موت کا پیغام ہو جاتی ہے، جس کا وہ قفس میں انتظار کر رہا ہے۔ زندگی کے اس المیے کا اس سے بہتر پیرایہ میں بیان نہیں ہو سکتا تھا اور جس تیور اور جس لہجہ میں اس صورت کو بیان کیا گیا ہے وہ ارسطو اور ملٹن کے نظریہ المیہ کی یاد دلاتے ہیں جس کی رو سے المیہ کا آخری انجام (calm of mind -

Calm of mind all passion spent) ہے یعنی تمام جذبات سے پاک ہو کر ہم ذہنی اور روحانی اعتدال اور سکون کی منزل پر پہنچ جائیں

یہ پوری غزل برسوں اہلِ ذوق کی زبانوں پر تھی، اس مشاعرے میں بہت سے اساتذہ شریک تھے لیکن کسی کی غزل کے ایک شعر کو بھی یہ حسنِ قبول نصیب نہیں ہوا اور واقعی یاسؔ کی اس غزل کا ہر شعر جدتِ فکر اور ندرتِ اسلوب کی اپنی آپ مثال ہے۔ ایک اور شعر سنئے

نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کے دل دھڑکتے ہیں
مبادا رنگ بو اڑ جائے پامالِ خزاں ہو کر۔

یہ شعر ہرگز ایسا نہیں کہ مشاعرے میں سن کر اس پر جھوم کے واہ واہ کر کے گزر جایا جائے۔ "نگاہِ شوق" اور "گلوں" کے پردہ میں ہم کو "حسن و عشق" کے درمیان جو پر تضاد نسبت ہے، اس کی منطقی لابدیت کو کس جالیاتی دلپذیری کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ حسن کی جابریت کا مضمون بہت عام ہے، معشوق کو قاتل، سفاک، لٹیرا، غارتگر ہم نہ جانے کب سے سنتے آئے ہیں، لیکن کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا کہ عشق اپنی تمام سپرگی اور افتادگی کے باوجود اتنا معصوم اور بے ضرر نہیں ہے، جتنا کہ ہم اس کو سمجھتے ہیں، عشق حسن کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے، اس نئے تصور کے لئے جیسا حسین پیرایہ اس شعر میں اختیار کیا گیا ہے اس سے زیادہ حسین پیرایہ تصور میں نہیں آسکتا۔

زندگی بڑی ضدی اور ناقابلِ اعتبار حقیقت ہے۔ ہم سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے، اس خیال کو شعرا اور فلاسفہ اپنے اپنے طریقوں پر برابر ہم کو سمجھاتے آئے ہیں، لیکن سب کے سمجھانے میں ایک سپرافگنی کا انداز پایا جاتا رہا ہے، یاسؔ بھی اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ہم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، مگر ان کے لہجہ میں انفعالیت اور بے بسی کا احساس نہیں ہے، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ زندگی کی رفتار اور زمانے کی حرکت کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے سب کچھ ہماری امیدوں اور ہمارے لگائے ہوئے حساب کے خلاف ہی لیکن اس سے ہم کو ہراساں نہیں ہونا چاہئے، بلکہ زندگی اور زمانہ کی رفتار کو نظر میں رکھتے ہوئے ہر غیر متوقع اور اچانک صورتِ حال کے لئے آمادہ رہنا چاہئے اور اپنے ارادہ اور ذوقِ سعی و عمل سے اس کے لئے ہر ممکن تدبیر و تدارک سوچتے رہنا چاہئے۔ شعر سنئے۔

عجب کیا وعدۂ فردا، بس فردا پہ ٹل جائے
کوئی شام اور آ جائے نہ شام بے سحر ہو کر

اب اس غزل کے کچھ اور اشعار سنئے اور تم کر ان پر خود غور کیجئے۔

زمانہ کی ہوا بدلی، نگاہِ آشنا بدلی
اٹھے محفل سے سب بیگانۂ شمعِ سحر ہو کر

کہاں پر نارسائی کی ہے پروانوں کی قسمت نے
پڑے ہیں منزلِ فانوس پر بے بال و پر ہو کر

خدا معلوم اس آغاز کا انجام کیا ہوگا؟
چھڑا ہے سازِ ہستی مبتدائے بے خبر ہو کر۔

مبارک نامِ آزادی، سلامت دامِ آزادی دعائیں دوں کسے یارب اسیرِ بال و پر ہو کر

ذرا پہلے اور آخری اشعار پر غور کیجیے گا۔ یہ تاثر و تفکر کا انداز، الفاظ کی دست کاری اور استعاروں کا یہ تقید (؟) ہندوستان بھر تک تو اردو شاعری کی اس نسل میں جو غدر کے بعد وجود میں آئی، کسی کے یہاں شاید ہی کہیں ملے۔ کائنات اور انسان کی فطرت کے اندرونی اور بنیادی تصادم کا ایسا شعور کم سے کم یاسؔ کے ہم عصر اردو شاعروں کے یہاں بہت کم پایا جاتا ہے۔ ذرا "دامِ آزادی" اور "اسیرِ بال و پر" کی ترکیبوں پر نہیں بلکہ ان کے اندر زندگی کی ماہیت کی طرف جو اشارے ہیں ان پر غور کیجیے۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد زندگی کی جدلیت، یہ عرفان اس حوصلہ مندی اور بلند ہمتی کے ساتھ، یاسؔ کے سوا کسی دوسرے اردو شاعر کے کلام میں نہیں ملتا اور اگر کہیں ملتا ہے تو اس میں نہ تو وہ تہ گیری ہے اور نہ ایسی ولولہ آفرینی۔

یاسؔ کے جتنے اشعار سنائے جا چکے ہیں، ان سے ہم کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ جدید اردو غزل میں یاسؔ کی شخصیت اور ان کا مقام کیا ہے۔ لیکن بڑی عبرت کی بات ہے کہ یاسؔ کی شاعری کی منزلت اور اس کی انفرادی قدر کی طرف اہلِ ذوق و نظر اتنا متوجہ نہ ہو سکے جتنا کہ ہونا چاہیے تھا، اور اسی وجہ سے شاعری کی نوجوان نسل کو ان کے کلام سے اثر قبول کرنے کا پورا موقع نہ مل سکا۔ یاسؔ زندگی کی نامرادیوں کا ماتم کرنے والے شاعر نہیں ہیں، وہ ولولہ اور ہمت کے شاعر ہیں اور نوجوانوں کو سب سے زیادہ انھیں دو عناصر کو اپنانے کی ضرورت تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ جب ہمارے نقاد اقبال سے اس وقت تک اردو غزل کا جائزہ لیتے ہیں تو چھوٹے بڑے بیشتر شاعروں کا ذکر کر جاتے ہیں اور یاسؔ کو یا تو بھول جاتے ہیں یا دو ایک فقروں یا جملوں میں ٹال دیتے ہیں، حالانکہ زندگی کا جو کس بل یاسؔ کے اشعار میں ہمیں محسوس ہوتا ہے وہ دورِ جدید کے کسی دوسرے غزل کے شاعر کے کلام میں نہیں محسوس ہوتا۔

میرے عزیز اور محترم دوست پروفیسر عبدالقادر سروری نے "جدید اردو شاعری" پر غالباً سب سے پہلی کتاب لکھی جو ادبی خلوص اور تحقیقی محنت و کاوش کے ساتھ تیار کی گئی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن شاید ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شاعروں میں یاسؔ اچھی طرح مشہور بھی ہو چکے تھے اور ان کا پہلا مجموعۂ کلام "نشترِ یاسؔ" شائع ہوئے ۳۱ سال ہو گئے تھے۔ تعجب کر "جدید اردو شاعری" میں کئی ایسے شاعروں کے ذکر مفصل یا مختصر طور پر مل جاتے ہیں جن کو صرف اس لئے شاعر کہیے کہ اس زمانے تک اخبار و رسائل میں ان کی نظمیں یا غزلیں چھپا کرتی تھیں، لیکن آج ان کو شاعر کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا۔ یاسؔ کا سرسری طور پر بھی کوئی ذکر اس کتاب میں نہیں ہے۔ اگر یہ بھول ہوتی تو بعد کے ایڈیشنوں میں اس کی تلافی کر دی گئی ہوتی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مصنف کی نظر سے آج تک یاسؔ کا کلام نہیں گزرا یا

یا انھوں نے اردو شاعری میں یاسؔ کو سرے سے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا

عبدالسلام ندوی کی شعر الہند کی دو جلدوں میں سے کسی جلد میں بھولے سے بھی یاسؔ کا نام نہیں لیا گیا ہے اور نہ ان کا کوئی شعر "جدید اردو شاعری" کے میلانات کے سلسلے میں مثال کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ حالانکہ اصغرؔ اور جگرؔ وغیرہ کے شعر مل جاتے ہیں، اگرچہ ان لوگوں کی شہرت، یاسؔ کی شہرت سے قدیم نہیں ہے۔ اور تو اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ نہ جانے کتنے غیر معروف اور انحطاطی شاعروں کے اشعار اس اردو شاعری کی پہلی مستقل کتاب میں جگہ پا گئے ہیں تو یاسؔ کا ایک شعر بھی اس میں نظر نہ آنا واقعی افسوس کی بات ہے۔

اردو شاعروں خاص کر جدید اردو شاعروں میں شاید کوئی دوسرا ایسا نہیں جو یاسؔ سے زیادہ بدنصیب رہا ہو جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گزشتہ تیس پینتیس سال کے اندر اردو شاعری کے ممتاز اہلِ ذوق اور نقاد حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ اور عصرِ جدید کے دوسرے سربرآوردہ شاعروں کا خیر مقدم کرتے ہوئے، یاسؔ کی طرف سے منہ پھیر کر گزر جاتے ہیں تو ہم کو عبرت ہوتی ہے اور ہم غم کر سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ زبان، اسلوب، اور فکری حجم میں یاسؔ کی شاعری اپنے ہم عصروں میں کسی کی شاعری سے کم نہیں ہے، بلکہ بعض اعتبارات سے ان کی آواز ایک بالکل نئے عنوان کی آواز ہے، جو وسعت بلندی اور زندہ دلی کیفیت میں اپنا خاص درجہ رکھتی ہے، پھر بھی لوگ ان کی طرف وہ توجہ نہ دے سکے جس کے وہ مستحق تھے اور جن لوگوں نے ان کے کلام کا مطالعہ کیا بھی، وہ ان سے آنکھیں چرا گئے۔ آخر اس کا راز کیا ہے؟ یاسؔ کی شاعری سے الگ ہو کر جب ہم ان کی زندگی کے سانحات و واردات پر نظر ڈالتے ہیں تو مجموعی طور پر ہم کو یہ احساس ہوتا ہے کہ یاسؔ کا ذاتی کردار، مزاج اور ماحول کے تصادم کی ایک نہایت افسوس ناک مثال ہے۔ یاسؔ فطرتاً ایک آزاد مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے جس کا سبب شاید یہ تھا کہ جاگیرداری کے انحطاطی دور میں انھوں نے تربیت پائی، اس پر طرہ یہ ہوا وہ فطرت کی طرف سے شاعری کی ایک نئی صلاحیت اور احساس و فکر کی ایک نئی قوت لے کر پیدا ہوئے جب تک وہ اپنے اصلی وطن عظیم آباد میں رہے، ان کے اندر کسی قسم کے تناقص کی علامت ظاہر نہیں ہوئی نشترِ یاسؔ کے اشعار اس دعوے کا ثبوت ہیں، یہ اشعار شاعر کے دورِ اولیں کی یادگار ہیں، یاسؔ کی زندگی میں پہلی بار پیکار اور تصادم کے آثار اس وقت ظاہر ہونا شروع ہوئے، جبکہ ۱۹۱۳ء میں ان کی شادی لکھنؤ میں ہوئی۔ عظیم آباد کی ولدیت اور لکھنؤ کی دامادی کا میل، یاسؔ کے حق میں ایک مستقل خطرہ بن گیا اور پھر ۱۹۱۴ء میں جب "نشترِ یاسؔ" لکھنؤ کے چند اساتذہ کی تعریفوں کے ساتھ شائع ہوا جس میں یاسؔ کو مسلم الثبوت سخنور قرار دیا گیا تھا تو لکھنؤ کے تنگ ظرف شاعروں کے حلقہ میں آگ لگ گئی، عزیزؔ اور ثاقبؔ جیسے شاعروں نے یاسؔ کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا اور یاسؔ کی مخالفت بڑی شدومد کے ساتھ ہونے لگی، یہ مخالفت ادبی چشمک کی حد سے گزر کر گندی اور رکیک

گالیوں تک پہنچ گئی پھر ایک طرف یاسؔ یکہ و تنہا اور بے یار و مددگار تھے، دوسری طرف ان کو ہر طرح کا آزار پہنچانے والوں کا پورا جرگہ تھا۔ یاسؔ کے مزاج میں مقابلہ اور نبرد آزمائی کا میلان ہمیشہ سے تھا، یہ میلان اب خشونت درشتی اور جنگ جوئی کی شکل میں ظاہر ہونے لگا، لیکن اکیلا سپاہی، لاکھ جوان مرد سہی اتنوں کے نرغہ میں پڑ کر کہاں تک اپنے کو سنبھالے رہ سکتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مزاج میں روز بروز کلبیت یعنی چڑچڑاپن بڑھتا گیا جس کو وہ اپنے نام کے آگے چنگیزی لگا کر وتیرہ جلیل بنانے کی کوشش کرنے لگے، لکھنؤ والے یاسؔ کو اپنے ایک داماد کی حیثیت سے قبول کر سکتے تھے اور قبول کر لیا تھا، لیکن ان کے اندر اتنا ظرف کبھی نہ تھا کہ کسی باہر کے بڑے سے بڑے شاعر کو لکھنؤ کے چھوٹے سے چھوٹے شاعر کے مقابلہ میں کوئی مقام دے سکیں، عزیزؔ اور صفیؔ اور ان کے گروہ نے یاسؔ کی شاعری کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھا اور ان کا نام تک مٹا دینے کی کوشش کرنے لگے۔ شاید یہ لوگ اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب ہوتے اگر خود یاسؔ وقار اور سنجیدگی کے ساتھ لکھنؤ والوں کی کھلی کھلی مخالفت پر بے نیازی کی نگاہ ڈال کر اس کو ٹال جاتے اور اتنی اہمیت نہ دیتے مگر وہ بھی خم ٹھونک کر جاہلوں کی بھیڑ میں لڑنے کے لئے اتر گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ جب عامیوں اور جاہلوں سے کچھ بس نہ چلا تو ان کی چڑچڑاہٹ اور خشونت نے بڑھتے بڑھتے خود انھیں کو اپنا شکار بنا لیا، اور اب وہ جھلا کر خود اپنی ستائش کرنے لگے اور اپنے منہ میاں مٹھو بن گئے۔ وہ دراصل میرؔ، غالبؔ، آتشؔ، اور انیسؔ کے دل سے قائل تھے، اور ان سب کا احترام کرتے تھے، لیکن عزیزؔ اور صفیؔ کی ضد میں وہ خود اتنے سبک ہو گئے کہ نہ صرف اپنے کو غالبؔ کا "پیر" اور "ثانی میرؔ" سمجھنے لگے بلکہ غالبؔ کے "چچا" ہو کر "غالب شکن" پر اتر آئے، انھوں نے نظم یا نثر میں جو کچھ اپنی خود ستائی اور غالبؔ کی توہین میں لکھا ہے وہ یقیناً شائستہ مذاق رکھنے والوں کی نگاہ میں بڑی چھوٹی بات ہے، ان کے اس رویہ نے ان کی شاعری کی صحیح قدر و قیمت کو بڑا صدمہ پہنچایا۔

یگانہؔ اور چنگیزی ہونے سے پہلے یا اس میلان سے برطرف ہو کر یاسؔ نے جتنے اشعار کہے ہیں، وہ اردو غزل میں ایک نئے باب کا حکم رکھتے ہیں اور واقعی اردو شاعری کی آبرو ہی نہیں اس کا ناموس ہیں۔ ان اشعار کا مطالعہ کیا جائے، اور پھر نظم اور نثر میں انھوں نے جو چنگیزی معرکہ آرائیاں خوانخواہ دکھائی ہیں ان کو نگاہ میں رکھا جائے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا بڑا شاعر جو کائنات اور حیات انسانی کے رموز و نکات کی ایسی معرفت رکھتا ہو اور اتنے بلند مقام پر ہو اس نے ایسی پستی میں اتر آنا کیسے گوارا کیا، ہم کسی طرح یاسؔ اور یگانہؔ میں مطابقت نہیں کر پاتے۔

میں نے ۱۹۴۰ء میں "نگار" کے سالنامہ میں اپنا مضمون "غزل اور عصر جدید" لکھتے ہوئے، یاسؔ پر بھی اجمالی تبصرہ کیا تھا اور اس خیال کا بغیر کسی مروت یا رعایت کے اظہار کیا تھا کہ میں یاسؔ کو یگانہؔ مانتا اور نہ ان کی چنگیزی رنگ کا قائل ہوں اور ان کی اس ذہنیت نے ان کی شاعری کو بڑا نقصان پہنچایا ہے، اس کے جواب میں یاسؔ نے

حیدرآباد سے مجھے انتہائی خلوص کے ساتھ خط لکھا تھا اور مجھے یقین دلایا تھا کہ ان کی چنگیزی رگ مجھ جیسوں کے لئے نہیں ہے۔ اس کے بعد دسمبر ۱۹۰۲ء میں وہ میرے بلائے ہوئے سینٹ انڈوز کالج گورکھپور کے مشاعرے میں آئے اور میں نے ان سے کہا "یاسؔ صاحب مجھے اس سے تسکین نہیں ہوتی کہ آپ کی چنگیزی رگ مجھ جیسوں کے لئے نہیں ہے کسی کے لئے بھی آپ کی یہ رگ کیوں ہے؟"۔ وہ اپنے طبعی خلوص کے ساتھ میری بات پر خاموش ہوگئے۔ اور میں، نے ان کی خاموشی میں ایک اداسی محسوس کی۔

یاسؔ کی شاعری کو جانچنے اور اس کی صحیح قدر متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے کردار کے اس پہلو کو بالکل خاطر انداز کردیا جائے جس کو میں "عسکری پہلو" کہوں گا اور نثر اور نظم میں انھوں نے جو کچھ اپنے محاذراتی انداز میں لکھا یا کہا ہے اس کو وقتی اشتعال کا غیر متوازن اظہار سمجھ کر فضولیات کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے، اگر میری اس تجویز کے مطابق کوئی یاسؔ کے کلام کا غائر نظر سے مطالعہ کرے تو اس کو دو باتوں کا احساس ہوگا، ایک تو یہ کہ اگر ہم یاسؔ کے کلام کے چنگیزی حصے سے قطع نظر کرلیں تو ان کی کسی غزل سے اشعار کا انتخاب کرنا سہل کام نہیں ہے، اس لئے کہ ان کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی نئی بات، نیا انداز لئے ہوئے ہوتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ یاسؔ کی غزلیں مواد اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے غزل کی اس عام روایت سے ہٹی ہوئی ہیں جس کے ہم عرصہ سے خوگر چلے آتے ہیں اور جو یاسؔ کے ہم عصروں تک کی اصلی روح سمجھی جاتی ہے، آج بھی غزل کا بیشتر حصہ اس روایت کا حامل معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج بھی غزل میں "تازہ خیالی" اور "تازہ کاری" کے عناصر کی خاصی کمی محسوس ہوتی ہے۔

یاسؔ انفعالی رومانیت یا کراہتی ہوئی جذباتیت کے شاعر نہیں ہیں، وہ شعورِ حیات کے شاعر ہیں اور ان کے اشعار جانے انسدتام مخالف حوادث کے ساتھ مردانہ زور آزمائی کرتے ہوئے زندہ رہنے کی تاب پیدا کرتے ہیں، یاسؔ اردو غزل میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں، اسی لئے میں نے اپنے کسی مضمون میں غالباً "غزل اور عصرِ جدید" میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ نئی غزل کو اگر زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کو اپنے اندر سمونا ہے اور کائناتی اور انسانی وجود کے نئے شعور کی نمائندگی کرنا ہے تو اس کو اقبالؔ، یاسؔ اور فراقؔ کی غزلوں کو نظر میں رکھنا چاہئے، آج بھی میرا خیال ہے کہ ان شاعروں سے غزل کی نئی نسل بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ البتہ فراقؔ کا مطالعہ کرنے اور ان سے اثر قبول کرنے کے لئے اس بات کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ اکثر بہت طویل غزل لکھتے ہیں جن میں کافی اشعار ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف اپنی تنہائی کی دہشت دور کرنے اور اپنی زندگی کے گراں لمحات گزار دینے کے لئے کہے جاتے ہیں

یاسؔ کی شاعری کی سب سے بڑی ظاہری خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں تحریکِ شعری (poetic inspiration) کی شکست اور تکان اور زبان و اسلوب کی ناہمواری نہیں ملتی، آپ ان کے کسی

شعری فکری قدر کو تسلیم کریں یا نہ کریں ان کا شعر اچھا شعر ہوتا ہے، میں ان کے ہر شعر کو تغزل کی حیثیت سے قبول نہیں کرتا مگر ان کے ہر شعر میں بھوت کی طرح ستانے اور حافظہ پر چڑھے رہنے کی قوت تو ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ اشعار سنئے

من کہ برنمی تابم درد زیستن تنہا ۔۔۔ صبح دم چہ ساں بینم شمع انجمن تنہا

فرد اور انجمن اور پھر انجمن کے جدا افراد کے درمیان کیا ناگزیر رشتہ ہے؟ اس کو اس سے زیادہ بلیغ انداز میں بیان کرنا مشکل ہے، نہ کوئی فرد ہے نہ کوئی انجمن، اور نہ دونوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ جس ذی شعور کو اپنی تنہائی کا غم ہوگا، اس کو دوسرے کی تنہائی کا بھی غم ہوگا اور اس تنہائی کا غم دور کرنے کے لئے جماعت یا انجمن کی ضرورت ہوئی، بہت پرانا قول اب تک حیاتیاتی طور پر صحیح ہے، انسان جماعت پسند جانور ہے۔ یاس نے مرزا امداد بیگ شیرازی کے جواب میں ساڑھے پانچ صفحوں کا محاضرہ لکھ کر اپنی آبرو بھی ضائع کی اور شعر کا وقار بھی ڈبو دیا، اس غزل کے یہ شعر بھی سنئے:-

ہر گلے دہر خارے فتنہ بابر انگیزد ۔۔۔ الحذر دل حیراں صد بہار و من تنہا
صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ ۔۔۔ داد رانمی زیبد بال و پر بہ من تنہا

پہلے شعر کا تجزیہ کیجئے، پھول اور کانٹے دونوں توام ہیں اور دونوں فطرت کے اجزائے ترکیبی ہیں حسن بغیر قبح کے، خیر بغیر شر کے، ایک خیال موہوم کے سوا کچھ نہیں۔ دونوں کے میل ہی سے ہستی کی یہ ساری رنگارنگی ہے، لیکن اس نگار خانہ خوب و زشت میں اگر ایک فرد بشر تنہا چھوڑ دیا جائے تو اس کی وحشت کا کیا عالم ہوگا؟ کائنات کی نیرنگیوں سے بھرپور بہرہ اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ایک جیسے ہزاروں انسان ساتھ ہوں اور مل کر عالم فطرت سے لطف اور فائدہ اٹھائیں۔

دوسرے شعر پر غور کیجئے، شاعر دل سے کہتا ہے کہ میں اکیلا بال و پر لیکر کیا کروں گا، میرے سینکڑوں ساتھی پر شکستہ اور زندگی سے دل برداشتہ پڑے ہیں، جب تک ان سب کو بال و پر نہ مل جائیں، تنہا میرے لئے بال و پر بیکار ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شاعر فرد اور جماعت جزو اور کل کا ایسا صحیح ادراک رکھتا ہو جو تنہا اپنی بہبود اپنے لئے باعث ننگ سمجھتا ہو اس کے اندر ذات پرستی اور خود بینی کا ایسا بدویانہ میلان کیوں کر پیدا ہو گیا کہ وہ غالب اور دیگر سبھی کی بلاوجہ تحقیر کرنے لگ گیا

یاس زندگی کے طربیہ رمز کی حقیقت کو اچھی طرح جان پہچان چکے ہیں، زندگی ایک تال سم یعنی اتار چڑھاؤ ہے جس "گردش فلک" یا "گردش زمانہ" یا "گردش تقدیر" کی شعرا اور علماء اب تک شکایت کرتے آئے ہیں، اس کا راز یہی ہے اس بنیادی راز کو جان لینے کے بعد یاس نے انسان کے مقدر اور اس کے منصب پر غور کرنا شروع کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ کسی حال میں بھی جی چھوٹا نہ کرے اور ہمت نہ ہارے، جب حدوث و انقلاب فطرت کا مزاج

ٹھہرا تو اس کو مسلہ سمجھ کر انسان کو چاہئیے کہ وہ تمام حادثات و تغیرات اور تمام حالات و موانع کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرے اور ان سب پر قابو پانے کے لئے جانبازانہ کوشش کرے یہی انسان کا مقدر اور یہی اس کا فطری منصب ہے اور جادو ٹونے کے قدیم ترین دور سے لے کر سائنس کے موجودہ دور تک انسان یہی کرتا رہا ہے، ورنہ آج بھی وہ اتنا ہی مجبور اور بے بس ہوتا جتنا کہ آفرینش کے ابتدائی ادوار میں رہا اور اس قابل ہرگز نہ ہوتا کہ تمام عناصر قدرت اور ساری کائنات پر فتح پاتا چلا جاتا۔ انسانی زندگی کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ اپنی مجبوریوں کا جائزہ لیتا رہے اور اپنے کو آزاد سے آزاد تر بنانے کے لئے جدوجہد کرتا جائے۔

یاسؔ کی شاعری کا مجموعی لب لہجہ یہی ہے، وہ نہ صرف ہم کو تخلیق کے راز سے آگاہ کرتے ہیں، بلکہ اسی کی خطرتی عظمت کا احساس دلا کر ہم کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ انسان اپنی جدوجہد سے اپنے کو عظیم سے عظیم تر بناتا جائے تاکہ میزان میں اس کی عظمت کا پلہ کائناتی عظمت سے بھاری رہے۔ یاسؔ کا شاید ہی کوئی شعر ایسا ہو جو ہمارے اندر جینے کی نئی سکت اور سعی و عمل کا تازہ حوصلہ نہ پیدا کرتا ہو ان کے وہاں صبر و تحمل کا تصور بھی مجہولی نہیں ہوتا بلکہ مجاہدانہ ہوتا ہے

اب کچھ منتخب اشعار سنئے اور جس طرح اس سے پہلے خود میں نے بعض اشعار کا تجزیہ کر کے ان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اسی طرح آپ بھی تہ تک ان کا جائزہ لیجئے۔

حسرت پرواز میں پر تولتے ہیں یاں اسیر ۔۔۔ وہ صبا مستانہ آئی وہ قفس کا در کھلا
صحبت واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں ۔۔۔ راز اپنی میکشی کا کیا کہیں کیوں کر کھلا
ہاتھ الجھا اب گریباں میں تو گھبرو نہ یاسؔ ۔۔۔ بیڑیاں کیوں کر کٹیں زنداں کا در کیوں کر کھلا

میں قفس میں بھی کسی سوز نہ خاموش رہا ۔۔۔ کشمکش میں بھی طبیعت کا وہی جوش رہا

دیکھو تو اپنے وحشیوں کی جامہ زیبیاں ۔۔۔ اللہ رے حسن پیرہنِ تار تار کا

ہوں ریگ کے مانند شب و روز سفر میں ۔۔۔ آوارۂ وحشت کوئی منزل نہیں رکھتا

پیالہ خالی اٹھا کر لگا لیا منہ سے ۔۔۔ کہ یاسؔ کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

چھوڑ کر جائیں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم — کونسی جا ہے جہاں حکم خزاں جاری نہیں
دردِ دل صیاد کو کچھ کچھ سنانا چاہئے — گھٹ کے مر جاؤں تو پھر لطف گرفتاری نہیں

گزرے ہوئے زمانہ کی اب یاد کیا ضرور — چرکے قفس نصیبوں میں کیوں آشیانے کے ہیں

یکساں کبھی کسی کی نہ گزرے زمانے میں — یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں
افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا — کنج قفس میں مر رہے یا آشیانے میں

ہنوز زندگی تلخ کا مزہ نہ ملا — کمال صبر ملا، صبر آزما نہ ملا
مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں تھی — مزاج اس دل بے اختیار نہ ملا۔
جواب کیا وہی آواز باز گشت آئی — قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزہ نہ ملا
امیدوار رہائی قفس بدوش چلے — جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا
امید ہم نے مارا ہمیں دورا ہے پر — کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا
سمجھ میں آگیا جب عذر فطرت مجبور — گناہ گار ازل کو نیا بہانہ ملا
خوشا نصیب جسے فیض عشق شور انگیز — بہ قدر ظرف ملا، ظرف سے سوا نہ ملا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں — سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا
مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا — مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا
مجھے لے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے — بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا — نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا
ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر — ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

تڑپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے آخر — تلاش یار میں جب کوئی کارواں نکلا

دکھایا گو سکندر نے بڑھا کے آئینہ　　جو سر اٹھا کے کوئی زیر آسماں نکلا

بس ایک سایۂ دیوار یار کیا کم ہے　　اٹھا لے سر سے مرے سایہ آسماں اپنا
مزے کے ساتھ ہوں اندوہ و غم تو کیا کہنا　　یقیں نہ ہو تو کوئی کر لے امتحاں اپنا
جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا۔　　نکل چکا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا

زنجیر پھر ہلا دی نسیم بہار نے　　پھر باہر آپ سے ترا دیوانہ ہو گیا

لب دریا سے غرض ہے نہ تہ دریا سے　　موج و گرداب سے ہے دست و گریباں ہونا

وحشیو! کیوں تنگ دل ہو فصل گل آنے تو دو　　غنچہ غنچہ میں بہار صد گریباں دیکھنا

خاک کا پتلا بگولا دشت کا ہو جائے گا　　مٹ کے بھی اک پیکر نشو و نما ہو جائے گا
بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دست ہوس　　گھٹتے گھٹتے ایک دن دست دعا ہو جائیگا

عجب کیا ہے ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے　　زمانے کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا۔

خامۂ قدرت کی ہر صنعت ہے آپ اپنی مثال　　امتیاز خوب و زشت آنکھوں کو مشکل ہو گیا

کیوں یاس یونہی دور سے منہ تکتے رہو گے　　بے مانگے تو اس بزم میں ساغر نہیں ملتا

خار و گل دونوں کو اپنے بانکپن پر ناز ہے　　دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدان بہار

آنکھ والے راہ میں حیرت کے پتلے بن گئے۔　　کچھ نہ سوجھا خاک کے پتلوں کا عالم دیکھ کر

زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہوکر عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہوکر
دبال رنگ و بو سے چھوٹتے ہی پر نکالیں گے گراں بار بہار آخر سبکدوش خزاں ہوکر
اسے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جانا دھواں ہوکر

خدا جانے اجل کو پہلے کس پر رحم آئے گا گرفتار قفس پر یا گرفتار نشیمن پر

داور حشر ہوشیار دونوں میں امتیاز رکھ بندۂ نا امید اور بندہ بے نیاز میں

ذوق جب تک ہے جبھی تک ہے بہار رنگ و بو دل ہے جب تک دل جبھی تک ہے کھٹک بھی خار میں

منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے شور جرس سے دل نہ رہا اختیار میں۔

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں۔
عمر بیداریٔ موہوم کے دھوکے میں کٹی اب جو چونکے ہیں تو آپ اپنا گلا کرتے ہیں

بندۂ فطرت مجبور ہوں، مختار نہیں۔ ہاں ندامت میں بے شک جرم سے انکار نہیں

ہم ایسے بد نصیب گرفتار آشیاں۔ کیا جانیں گرم و سرد خزان و بہار کو

یہ کس نے گرم رفتار فنا کی راہ کھوٹی کی بٹھا کر پردۂ فانوس میں شمع شبستاں کو
اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن گل کھلائیگی قفس سے چھوٹ کر سر پر اٹھا لیں گے گلستاں کو
مزاج حسن بدلے، آسماں بدلے، زمیں بدلے سزائے عشق کیا بدلے گی ذوق ناشکیباں کو

کارگاہ دنیا کی، نیستی بھی، ہستی ہے اک طرف اجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

لپٹتی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے
پلٹ کر اک سلامِ شوق کر لیتا ہوں منزل سے

ٹھٹھک رہے حرم و دیر کے دوراہے پر
خلاف جا نہ سکے شاہراہِ فطرت کے
گلا نہ کاٹ سکے اپنا، دائے ناکامی
پہاڑ کاٹتے ہیں روز و شب مصیبت کے
نگاہِ یاس ہے آئینۂ غمِ فردا
نظر کے سامنے ساماں ہیں قیامت کے

ہنوز گوش بر آوازِ غیب ہے کوئی
امیدوارِ ازل اب تک انتظار میں ہے

ایسا رونا بھی کوئی رونا ہے
آستیں آنسوؤں سے تر نہ ہوئی

ہمتِ عالی سلامت ہے تو اندیشہ ہو کیا
پائے در زنجیر سے یا پائے در گل سے مجھے

دلیلِ راہ، دلِ شب چراغ تھا اپنا
بلند و پست میں گزری ہے جستجو کرتے

رات، دن، شوقِ رہائی میں کوئی سر پٹکے
کوئی زنجیر کی جھنکار سے دیوانہ بنے

ناخدا کو نہیں اب تک نہ دریا کی خبر
ڈوب کر دیکھیے تو بیگانۂ ساحل ہو جائے

کوئی تصویرِ خزاں ہے کوئی تصویرِ بہار
دیدنی ہیں کارنامے خامۂ تقدیر کے

دل عجب جلوۂ موہوم دکھاتا ہے مجھے
شام سے پاس سویرا نظر آتا ہے مجھے

سزائے عشق بقدرِ گناہ ناممکن
یہی بہت ہے کہ برہم مزاجِ یار رہے
تڑپ تڑپ کے اٹھاؤں گا زندگی کے مزے
خدا نہ کردہ مجھے دل پہ اختیار رہے

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولہ　　مٹنے پہ بھی اک ہستیٔ برباد رہے گی
شیطان کا شیطان، فرشتہ کا فرشتہ　　انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی.
ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش　　دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

بہار زندگی ناداں بہار جاوداں کیوں ہو　　یہ دنیا ہے تو ہر کروٹ وہی آرام جاں کیوں ہو
یہ ناہموار ہی ہموار ہو جائے تو کیا کہیے　　زمیں سے جب نہیں فرصت تو فکر آسماں کیوں ہو

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ یاسؔ کے کلام کا انتخاب کرنا مشکل کام ہے، میں نے منتخب اشعار پیش کرنے کی کوشش کی ہے. جن کی تعداد کم کرتے کرتے اتنی ہو گئی ہے۔ اپنا دائرہ غزل تک محدود رکھا ہے، یاسؔ نے رباعیاں بھی کہیں ہیں اور ماہرانہ قدرت کے ساتھ کہی ہیں، لیکن یاسؔ کا اصلی فن غزل کے دو دو مصرعوں کو معنوی بلاغتوں اور اسلوبی نزاکتوں سے معمور کر دینا ہے اور اس فن میں وہ یقیناً یگانہ ہیں اگرچہ میں ان کے یگانہ آرٹ کا قائل نہیں.

یاسؔ نے چار شاعروں کا اعتراف کیا ہے اور چاروں سے اثرات قبول کئے ہیں، یعنی میرؔ، غالبؔ، آتشؔ اور انیسؔ۔ انیسؔ کا اثر تو خیر ان کے یہاں تبرک ہی کے طور پر ہے، لیکن، میرؔ، غالبؔ اور آتشؔ سے انہوں نے ڈوب کر اثرات لئے ہیں اور یہ اثرات ان کی شاعری کے ریشہ ریشہ میں سمائے ہوئے ہیں. وہ خود اپنے کو "حضرت آتشؔ کا ہم زباں" سمجھتے ہیں. یہ دانستہ تجاہل نہیں تو خود فریبی ضرور ہے، یاسؔ کے کلام میں جو حوصلے ہمت اور مردانہ بانکپن پایا جاتا ہے وہ یقیناً آتشؔ کا ترکہ ہے، لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے. یاسؔ کے اشعار میں تفکر و تامل اور حکیمانہ ادراک کے جو نمایاں عناصر ہیں وہ غالبؔ کی دین ہیں اور ان کے تیور اور لب و لہجہ میں اس درد کا جو پرگداز احساس ہے جس سے زندگی کا خمیر ہوا ہے اور جس کے بغیر انسان کے نفس کی تہذیب نہیں ہو سکتی، وہ میرؔ کی لائی ہوئی برکت ہے، اگر میرؔ اور غالبؔ بھی ان کی شاعری کی تشکیل میں شریک نہ ہوتے تو اکیلے آتشؔ، یاسؔ کو نہیں بنا سکتے تھے.

دیویندر اِسّر

ادب اور جنسیات

یونانی دیومالا کی ایک روایت ہے کہ قدیم دور میں اس دنیا میں ایسے لوگ بستے تھے جو نیم مرد اور نیم عورت تھے، ان لوگوں کو اپنی کاملیت پر بڑا ناز تھا، اور اسی ناز کے باعث وہ دیوتاؤں کے خلاف بغاوت کر بیٹھے۔ کہتے ہیں کہ دیوتاؤں کے بادشاہ زئیس نے ان کے اس غرور اور بغاوت سے خفا ہو کر ان لوگوں کے دو دو الگ ٹکڑے کر کے زمین پر پھینک دیئے، نیم مرد اور نیم عورت، اس وقت سے لے کر آج تک مرد اور عورت کے یہ منقسم حصے، ایک دوسرے میں مدغم ہو کر تکمیل پانے کی کوشش کر رہے ہیں ایک دوسرے کے لئے یہی تڑپ اور کشش عشق ہے، اور ان کا اتصال ہی تکمیل عشق ہے۔

اب نامور انگریز شاعر سون برن (SWIN BURN) کی ایک نظم ملاحظہ فرمائیے

Ah that my lips were tuneless lips, but pressed
To the bruised blossom of thy scouraged white breast!
Ah that my mouth for Muse's milk were fed
On thy sweet blood thy sweet small wounds had bled!
That with my tongue I felt them and could taste
The faint flakes from thy bosom to the waist!
That I could drink thy veins as wine and eat
Thy breasts like honey! that from face to feet
Thy body were abolished and consumed,
And in my flesh thy very flesh entombed.

جسموں کا ایک دوسرے میں مدغم ہوکر ایک کامل حسین پیکر بن جانے کا شعور پیش کرنے کے جرم میں سون برن کو کیا کیا نہیں سننا پڑا

> "An unclean fiery imp from pit .... the libidinous laureate of a pack of satyrs with a mind aflame with feverish carnality of a school boy over the dirtiest pages of Lampriere.
>
> (Saturday Review, 4 August, 1866)
>
> اور انگریزی رسالہ پنچ نے سون برن کو سوائن بارن (SWINE BORN) یعنے خنزیر تک کا لقب دے دیا"

عورت اور مرد کی باہمی جنسی کشش اور خواہش وصل جسے یونانی دیومالا نے تخیلی طور پر اور سون برن نے فنی طور پر پیش کیا ہے، اس کے خلاف تجو کا یہ پرچار کیوں؟ تجو پرستوں کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ جنسی جذبہ فطری ہے اور خواہش وصل بھی فطری ہے، انھوں نے بھی جنسی ناآسودگی کی اذیت ضرور محسوس کی ہوگی لیکن انھیں یہ ذہن نشین کرانا ضروری ہے کہ جنسی جذبہ صرف انسانی نسل کی افزائش اور بقا کے لئے ہی لازمی نہیں بلکہ ادب اور فن کی انسپریشن بھی جنسی جذبہ ہے، دنیا کے ادب اور فن کے بیشتر اور بہترین حصے کا موضوع جنس ہی ہے، پھر بھی جب اس قوتِ حیات کو ادب و فن میں پیش کیا جاتا ہے تو، ریاست، سماج، مذہب، اخلاق، روایت اور رائے عامہ سب حرکت میں آجاتے ہیں اور ایسے ادب کو مخرب اخلاق، فحش اور خلاف تہذیب قرار دے کر امتناع کا نعرہ لگاتے ہیں۔ یہ کیسی تہذیب ہے، جس کی بنیاد نفس کشی ہے اور جس کی منتہا موت ہے، ہمارا سماج جنسی کشش کے اس فطری جذبہ کو ایک نورمل صحتمند نقطۂ نظر سے سمجھنے میں صرف ناکام رہا ہے بلکہ کسی مبہم خوف اور جھوٹے اخلاق کے باعث فرار اور کجروی کا شکار رہا ہے اور اب بھی ہے، حالانکہ تہذیب کا سب سے اہم اور تخلیقی فریضہ یہی ہے کہ وہ اس جذبے کا صحیح مقام متعین کرے اور اسے تکمیل شخصیت کے نقطۂ عروج پر پہنچا دے

لیکن ہمارے معاشرے کی بد قسمتی ہے کہ جب بھی ادب میں جنس کا ذکر آیا تو روایت پرست دقیانوسی لوگوں نے جارحانہ رویہ اختیار کر لیا یا زیادہ سے زیادہ ایک مجرمانہ خاموشی اختیار کر لی، روایتی اخلاقی اقدار کے تحت زہد پرستی کا پرچار کیا جاتا ہے، پیوریٹن معترضین اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ انسانی شخصیت کی نشوونما میں جنسی جذبے

کے لاشعوری اظہار کا بڑا اہم حصہ ہے، اس لئے جب ہم جنس کی مسلم حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو ادب کے لئے لازمی ہے کہ وہ جنس کے موضوع پر سنجیدگی سے غور کرے اور حسن وحیات کو تقویت پہنچائے، ادب برائے حسن ہو یا برائے زندگی، ہر حالت میں اسی قوت حیات کی نمو کرتا رہے گا۔

یہاں ترقی پسند حضرات فوراً کہہ اٹھیں گے کہ انسانی بقا کے لئے بھوک کی تسکین کی اہمیت جنس کی تسکین سے زیادہ ہے، اس لئے ادب کا بنیادی موضوع بھوک ہونا چاہئیے، یہ بحث بے سود ہے کہ بقائے حیات کے لئے بھوک اور جنس میں کس کی اہمیت زیادہ ہے، بھوک کی تسکین بقائے نفس کے جذبے کی مظہر ہے اور جنسی جذبہ کی تسکین بقائے نسل کے جذبہ کی مظہر ہے، لہذا انسانی زندگی کی بقا کے لئے اتنی ہی اہم ہے، لیکن ادب میں اس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس جبلت کے ساتھ انسان کی روحانی اور جذباتی زندگی وابستہ ہے جس کا براہ راست تعلق ادب سے ہے، اس لئے ادب کا مرکزی موضوع بھوک کے بجائے جنس رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ ڈی ایچ لارنس نے کہا ہے کہ میرا اعتقاد ہے کہ انسانی شعور کو اب جنس کے احساسات اور جذبات اور انسان کے جسمانی تعلق کے گہرے اثرات کا احاطہ کرنا چاہئیے۔ بقول ہنڈلے اگر انسان کی جنسی خواہش اور ہر اس چیز کو جو ذہنی طور پر اس سے وابستہ ہے یا اس سے جنم لیتی ہے ختم کر دیا جائے تو زندگی سے شاعری اور شاید تمام اخلاقی جذبہ کا نام ونشان مٹ جائے گا ہر آدمی کسی نہ کسی روپ میں جنسی تحریک سے لذت اخذ کرتا ہے اور کیوں نہ کرے جبکہ جنسی جذبہ ہی ہماری زندگی میں حسن اور حرارت پیدا کرتا ہے اس حقیقت سے انکار خود فریبی ہے جنس کے احترام کی عدم موجودگی میں ہی فحش ادب جنم لیتا ہے، کوئی شرم، کوئی تصنع، کوئی فریب، کوئی اخلاق، کوئی خوف ہمیں اپنے وجود کو جنسی طور پر مانع نہیں ہونا چاہئیے

"جنس اور حسن ایک ہی چیز ہے شعلہ اور آگ کی طرح، اگر تم جنس سے نفرت کرتے ہو تو تم حسن سے بھی نفرت کرتے ہو، اگر تم زندہ حسن سے پیار کرتے ہو تو تمہارے اندر جنس کے لئے احترام ہے بیشک تم سن رسیدہ اور مردہ حسن سے پیار کر سکتے ہو اور جنس سے نفرت، لیکن حسن سے پیار کرنے کے لئے جنس کا احترام لازمی ہے، جنس اور حسن ناقابل تقسیم ہیں، جیسے زندگی اور شعور، جو ذہانت جنس اور حسن سے وابستہ ہے اور جنس اور حسن سے جنم لیتی ہے، وہی وجدان ہے، ہماری شاندار تہذیب کے عظیم فنا کا باعث جنس سے مریضانہ نفرت ہے، اگر ہماری تہذیب ہمیں یہ سکھاتی کہ کیسے جنسی کشش کا صحیح اور نفیس اظہار ہو سکتا ہے، کیسے جنسی جذبہ کو پاکیزہ اور زندہ رکھا جا سکتا ہے، اظہار اور

قوت کے گوناگوں جلوؤں سے اسے روشن اور قائم و دائم رکھا جا سکتا ہے تو ہم سب پیار کی زندگی بسر کرتے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں زندگی کی حرارت ہوتی اور ہم ہر طرح سے ہر کام کے لئے شدت جذبہ سے مسحور ہوتے، لیکن اب زندگی سرد راتوں کی طرح بجھی ہوئی ہے۔

میں اپنے جنسی خیالات سے شرمسار نہیں ہوں، وہ میرا وجود ہیں، وہ میری زندگی کا حصہ ہیں میں اپنے آپ کو جنسی طور پر قبول کرتا ہوں۔ جیسا کہ میں اپنے آپ کو ذہنی اور روحانی طور پر جانتا ہوں۔ میری جنس میری ہے جیسے میرا ذہن میرا ہے، کوئی بھی اس کے باعث مجھے شرمسار نہیں کر سکتا جنس کے خوف پر غلبہ حاصل کرو اور اس کے فطری اظہار کو بحال کرو، فحش الفاظ تک کو بحال کرو، جو کہ اس کے فطری اظہار کا حصہ ہیں اگر ہم زندگی میں جنس کی حرارت شامل نہیں کرتے تو ہمیں وحشیانہ تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہماری شاندار تہذیب میں جنسی جذبہ خود کاری کی طرف راغب ہوتا ہے اور ہمارے ہر دلعزیز ادب کا بیشتر حصہ اور تفریح طبع کے زیادہ تر سامان خودکاری کے لئے موجود ہیں، اور شاید ایک دن عام لوگ بھی اس حقیقت کا سامنا کرنے کی خواہش کریں گے اور خود دیکھیں گے کہ خفیہ خود کاری، پرکیف فلم اور موجودہ مقبول ادب کی فحاشی اور Boccaccio اور یونانی دیس پینٹنگ اور یورپین آرٹ میں جنسی جذبہ کے اظہار میں کیا فرق ہے، جو کہ ہمارے شعور اور تسکین کیلئے لازمی ہے۔"

ڈی، ایچ، لارنس

ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ایمانداری سے جنس کی سادہ اور فطری تحریک سے نفرت کرتے ہیں، لیکن ایسے لوگ بیمار ذہن کے مالک ہیں جو در حقیقت زندگی سے نفرت کرتے ہیں۔ ایسے مایوس اور نامراد لوگ ہمیشہ تشنۂ تسکین رہتے ہیں، لیکن پوشیدہ طور پر جنس کی غیر فطری تسکین سے حظ اٹھاتے ہیں جو لوگ جنس کے ہر مظہر کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور اس کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں وہ غیر فطری طرز زندگی بسر کر رہے ہیں، جو تہذیب، ضبط نفس اور نفس کشی کی اقدار پر مبنی ہو، اس کا فنا لازمی ہے، ضبط نفس بیماری ذہن اور نفس کشی خواہش مرگ، جنسی جذبہ کا اظہار کسی نہ کسی روپ میں تو ضرور ہوگا۔ اگر اس جذبے کے فطری اظہار کے راستے مسدود کر دئے جائیں گے تو یہ غیر فطری اور مریضانہ طور پر ظاہر ہوگا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ مفکرین، ماہر نفسیات اور ماہرین سماجیات نے جنسی جذبے کی بے پناہ قوت اور

اس کی قلب ماہیت کے بارے میں ہمارے علم میں اضافہ کیا ہے، ہم ابھی تک جنس کے موضوع کو شجر ممنوعہ کا درجہ دیتے آئے ہیں، اس کے باوجود کہ ہمارے سماج میں ایک گہری سازش ہے کہ ہم جنس کے بارے میں صاف گوئی بے باکی اور ایمان داری سے بات چیت نہ کر سکیں، جنس کا موضوع ہر خاص و عام کا پسندیدہ موضوع رہا ہے، چھپے چوری اس سے ہزاروں داستانیں وابستہ ہو گئیں، جو سرگوشیوں کے انداز میں فحش لطیفوں اور داستانوں کی صورت میں لوگوں کی تسکین کا باعث بنتے رہے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ انسانی زندگی میں فحاشی کا بھی ایک ضروری فعل ہے، لیکن اگر جنسی جذبے کے صحت مندانہ اظہار پر غیر فطری بندشیں عائد کی گئیں تو یہی حرارت مریضانہ صورت اختیار کر کے زندگی میں زہر سرایت کرے گی، نیا ادب جسے ترقی پسند ادب کا نام بھی دیا گیا جنس کے موضوع پر عائد کردہ روایتی اخلاق کی پابندیوں کے خلاف احتجاج تھا، لیکن ترقی پسندوں نے جب صفائی کی مہم شروع کی تو ان ادیبوں پر بھی برس پڑے، جن کی تخلیقات کا موضوع جنس تھا۔ وہ یہ بھول گئے کہ جب زندگی کی بنیادی جبلت جنس ہو تو ادب اس سے کیسے کنارہ کر سکتا ہے، ان کی اسی زہد پرستی نے جنس کے موضوع کو فحش نگاروں کے ساتھ پچھاڑ دیا جو حسن، اخلاق، ادب اور زندگی کی اقدار سے ناواقف ہیں، ادب میں جب مریضانہ جنسی پرستی غالب آ جائے تو دو ہی قسم کا ادب، جنسی ادب اور غیر جنسی ادب کھوکھلا اور مصنوعی ہو جاتا ہے۔ ادب تو برائے زندگی رہ جاتا ہے اور نہ ہی برائے حسن، وہ بحیثیت ادب کے ہی ختم ہو جاتا ہے

ادب میں جب بھی جنس کا ذکر آئے گا تو محافظ اخلاق نوجوان قارئین کی دہائی دیں گے جن کے اخلاق پر ایسے ادب سے برا اثر پڑنے کا خطرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر کتاب ہر عمر اور ہر ذوق کے لوگوں کے لئے نہیں ہوتی، ادب بالغ لوگوں کے مطالعہ کے لئے لکھا جاتا ہے

> "یہ حقیقت ایک فرانسیسی افسانہ نگار کے نزدیک ذہنی پابندی ہے اور موسیو اُولا ایسے مصنوعی حالات کے تحت لکھی گئی تحریروں پر سنجیدگی سے غور کرنے سے انکار کرے گا، نوجوان کنواری لڑکیوں کے لئے آدھی زندگی بند کتاب ہے اور اس ناول کی کیا وقعت ہے جو محض آدھی زندگی کو پیش کرتا ہے"
>
> ہنری جیمز

یہ درست ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ طبعی عمر سے تو بالغ ہو جاتے ہیں لیکن ذہنی طور پر ان کی عمر بارہ اور سولہ سال کے درمیان ہی رہتی ہے، اس لئے جنسی ادب کا سوال اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے، لیکن اس بات کو تسلیم

کرنا پڑے گا کہ بچوں اور خام عمر کے نوجوانوں کے لئے علیحدہ ادب کی تخلیق ضروری ہے اور اس کی طرف توجہ دینی چاہئیے۔ یہ نوجوان طبقہ (اور خام عمر کے بالغ لوگ) ہی سستا فحش ادب پڑھتے ہیں، اس لئے جنس کے موضوع پر پابندی عائد کرنے کی بجائے ان لوگوں کے لئے ایسے ادب کی تخلیق کی جائے جو ان کی نشو ونما میں ممد ثابت ہو

"فن اور دو شیزاؤں کا ملاپ ممکن نہیں، لہٰذا ان کو یکجا کرنے کی کوششیں بے سود ہیں، اس سے کسی فن کار کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نوجوانوں کو ان کی عمر اور ذوق کے مطابق صحیح ادب دیا جائے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی راہ نکالی جائے جس سے ناول نگار کو یہ آزادی ہو کہ اپنے دور کے مذہبی اور اخلاقی احساسات کو جیسا وہ محسوس کرتا ہے بیان کر سکے اور اسے مجبور نہ کیا جائے کہ وہ والدین اور گارڈین کی مدد کے لئے یہ لکھے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش روایتی اعتقادات کے مطابق کس طرح کر سکتے ہیں"۔

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ ادب کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں، ادب کا اخلاقی پہلو ہے جس کے باعث وہ اقدار کا حامل ہوتا ہے، لیکن ادب میں ہم کسی مذہبی، روایتی اخلاق کے پابند نہیں ہوتے بلکہ اصلی اخلاق (Essential Moral) کو پیش کرتے ہیں، اصلی اخلاق سے مراد وہ اخلاق ہے جو کسی شئے کی تکمیل کرے یا اس کی تکمیل میں ممد ثابت ہو جس کے لئے اس شے نے جنم لیا ہو یا بنائی گئی ہے، یہ اخلاق ہر شئے کی اندرونی ماہیت کو پیش کرتا ہے، اور اس کے اندرونی جوہر کی تکمیل کے راستے میں جو رکاوٹیں درپیش ہوتی ہیں وہ چاہے مذہب یا روایتی اخلاق کی ہوں، غلط اخلاقی اقدار کی حامل ہیں، اس لئے اعلیٰ فنکار روایت سے بغاوت کرتے ہیں تو انھیں طنز و دشنام کا نشانہ بننا پڑتا ہے کیونکہ وہ اصلی اخلاق کو پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں، ایک فن پارہ اسی وقت حقیقی اور یقین آمیز ہو سکتا ہے اور فن کار سچا اور صحیح معنوں میں با اخلاق ہے، جب وہ اس اصلی اخلاق کو پیش کرتا ہے، چاہے یہ اقدار مذہب اور روایتی اخلاق اور رائے عامہ اور ریاست کے وجود کے خلاف ہوں ادب میں اخلاق، نفسیات کا پروردہ ہے نہ کہ روایت کا۔ اس لئے نئی اخلاق اور روایتی اخلاق میں کشمکش ناگزیر ہے، جدید نفسیات نے اقدار کے شعور میں نئی راہیں وا کردی ہیں۔ اور اب ہم جنسی نفسیات کے رول کا صحیح مقام معین کر سکتے ہیں

ادب میں جنس کے موضوع کا ایک پہلو اور بھی ہے، ادب جنس کے حیاتیاتی فعل کو پیش نہیں کرتا، یہ کام تو

جنسیات پر لکھی گئی سائنٹفک کتابوں کا ہے لیکن جہاں تک جنس کے نفسیاتی اور جذباتی پہلو کا تعلق ہے ادب کو اس سے دلچسپی ہے۔ فرائیڈ نے ادب، فن کو قلب ماہیت اور ارتفاع قرار دیا ہے، ادب جنسی جذبے کا ہی مظہر ہے

"His Torians of Civilization" میں فرائیڈ نے اسی خیال کی وضاحت کی ہے کہ انسان کے فطری جذبے کو تعمیری تہذیبی اور سماجی طور پر کارآمد ذریعے سے منتقل کرنا ہی قلب ماہیت ہے، انسانی تہذیب اسی قلب ماہیت کی مرہون منت ہے کہ ہم کس حد تک اپنی فطری جبلتوں کا ارتفاع کر سکتے ہیں، ادب اور فن اسی قلب ماہیت کا نتیجہ ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیق فن میں جنسی جذبہ ایک اہم اور قابل قدر فریضہ سرانجام دیتا ہے ظاہر ہے کہ تخلیق کا عمل اس وقت حرکت میں آتا ہے جب ہم انسان کے genitals سے پرے مکمل جسم کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں، لیکن بہر صورت جنسی تحریک کا نمایاں اثر رہتا ہے اور یہ طریقہ کار جنسی جذبے کو سماجی طور پر کارآمد اور نفیس طریقے سے پیش کرتا ہے

> "تخلیقی عمل کے بعد ایسا ہی جنسی اور جسمانی ردعمل ہوتا ہے جیسا کہ مباشرت کے بعد یا اس کے برعکس یہ شاید جنسی جذبے کے ذریعے مظہر ہوتا ہے جس کی تسکین ضروری ہے، دونوں ردعمل سے ظاہر ہے کہ جنس فنکار کے تخلیقی عمل میں شامل ہے — لنڈ پڈرحم
>
> ہربرٹ ریڈ نے بھی تخلیقی عمل کی spontaniety اور تکمیل کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ۔
> جس طرح شہوت کے عروج پر خود بخود انزال ہوتا ہے اسی طرح فنی تخلیق کی آورد ہوتی ہے"

جس ادب کو فحش ادب کا درجہ دیا جاتا ہے، اس میں جنسی جذبے کی قلب ماہیت نہیں ہوتی، بلکہ ادب کو جنسی تسکین کا براہ راست ذریعہ سمجھا جاتا ہے، ادیب جنسی جذبے کو تعمیری حسین اور افادی ارتفاع کے ذریعے پیش نہیں کرتا بلکہ جنسی افعال کے تفصیلی تذکرے سے قاری کی جنسی تسکین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ مسرت باعث مسرت نہ ہو کر جنسی ترغیب کی طرف مائل کرتی ہے جو نہ صرف پہلے کی طرح ہی تشنۂ تکمیل رہتی ہے بلکہ زیادہ ہیجان پیدا کرتی ہے اور اس طرح یہ مصنوعی عمل جاری رہتا ہے اور جب جنسی جذبے کے اظہار کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں تو وہ مریضانہ شکل اختیار کر لیتا ہے، علاوہ ازیں سے جمالیاتی حظ حاصل کرنے کے لئے تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے، تصویر فحش بھی ہو سکتی ہے، جبکہ احساس حسن کے بجائے ننگے پن کا ہو، اس لئے بعض تصاویر جن میں لباس موجود بھی ہوتا ہے، فحش ہو سکتی ہیں، کیونکہ ان میں برہنگی کے اسی احساس کو سرایت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس احساس کو قبول کرنے

میں ناظرین کی اپنی ذہنی ساخت بھی ذمہ دار ہوتی ہے، صحیح جنسی ادب جنسی جذبے کی اس کجروی کو روکتا ہے اور اسے مریضانہ ماحول سے نکال کر صحت مند منزل کی طرف لے جاتا ہے، درحقیقت ادب شخصیت کی سالمیت کو بحال کرنے اور برقرار رکھنے کا اہم فریضہ سرانجام دیتا ہے، جدید سماج کی روایتی اقدار کی پروردہ ذہنی کجروی سے بچنے کے لئے جنسی ادب کی ضرورت ہے دراصل ایسا ادب Safety Valve کا کام کرتا ہے، ورنہ سماج میں افراتفری پیدا ہو جائے گی، لیکن یہ سوال محض جنسی ادب کی تخلیق سے ہی ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ ہمارے کلچر اور ذوق کی ازسرِنو تشکیل کی ضرورت ہے۔ قارئین کی ذہنی بلوغت شرط ہے، ورنہ جنس کے بارے میں سائنٹفک کتابوں سے بھی لوگ جنسی حظ حاصل کرتے ہیں۔

> "اگر نیوڈ (Nude) کو اس طرح پیش کیا جائے کہ یہ ناظرین میں جسمانی خیالات یا خواہشات پیدا کرتا ہے تو یہ جھوٹا آرٹ اور برا اخلاق ہے" (الیگزینڈر)
>
> نیوڈ چاہے کتنی ہی تجریدی کیوں نہ ہو ناظرین میں کچھ شہوانی احساس ضرور پیدا کرتی ہے چاہے وہ کتنا ہی مدہم کیوں نہ ہو، اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو وہ برا آرٹ اور جھوٹا اخلاق ہے" (کینتھ کلارک)

جنسی جذبے کا سب سے اعلیٰ مظہر عشق ہے، عشق تعلیم ادب کا موضوع رہا ہے، ہر دور میں عشق کی نفسیات اور فلسفی کا تجزیہ مفکرین کا پسندیدہ موضوع رہا ہے، ادب اور زندگی کے دوامی حسن اور رفعت کا راز عشق ہی میں مضمر ہے اور اگر یہ جذبہ مریضانہ صورت اختیار کرے، کجروی کا شکار ہو جائے یا مردہ ہو جائے تو انسانی تہذیب کے عظیم المیے جنم لیتے ہیں، لیکن کچھ ادیبوں کی تخلیقات میں عشق کی نوعیت غیر جنسی ہے اور انھیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ عشق کی تقدیس کو قائم رکھے ہوئے ہیں، انھوں نے انسانی زندگی کی رفعت کیلئے تجریدی، جذباتی، اور روحانی طور پر جذبۂ عشق کی پرستش کی ہے، ایسے لوگ جنس کو ذہنی سطح سے پیش کرتے ہیں، جو کہ نہ صرف نفسیاتی طور پر غلط ہے بلکہ تباہ کن بھی ہے، عشق کے جنسی پہلو پر روشنی ڈالنے اور اسے تسلیم کرنے سے عشق کی عظمت کم نہیں ہوگی، بلکہ اس کی رفعت اور شدت میں اضافہ ہوگا۔ جارج ایلیٹ اور جارج سینڈ پر تو یہ الزام عائد کیا جاتا تھا کہ وہ عشق کا تذکرہ ایک عجیب غالب قوت کی صورت میں کرتے ہیں جو ہمارے حواس کے ذریعے ہماری روح کو سول لیتا ہے۔ عشق ایک تجریدی تخیل نہیں بلکہ اس کی جسمانی اہمیت ہے، ہندستانی فلموں میں رقیب روسیاہ سے مراد وہ آدمی ہے جو شہوت کا شکار ہے، جو ہیروئن سے جنسی، جسمانی رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے جبکہ ہیرو جنسی جذبے سے آزاد کوئی پارسا ہے، یعنی اسے سچا عشق ہے اور اسے جسم کی خواہش نہیں، ایسے لوگ غیر فطری زندگی بسر کرتے ہیں اور رقیب کے مقابلے میں کم ایماندار ہیں جن فلموں میں ہیرو Ideal عشق کا قائل ہے وہ

فحش ہیں کیونکہ وہ مصنوعی طریقے سے جنسی ترغیب تو دیتی ہے لیکن اس کے فطری اظہار کے خلاف پاکیزگی کا غیر فطری معیار پیش کرتی ہیں، عشق کی تکمیل، عورت اور مرد کا جذباتی روحانی اور جسمانی اتصال ہے۔ مرد اور عورت کے باہمی ملاپ کا مقصد محض افزائش نسل ہی نہیں اور نہ صرف کسی سماجی آدرش کی تکمیل ہے، بلکہ شخصیت کی تکمیل ہے یہ ملاپ ایک جدوجہد ہے کہ زندگی کی سالمیت اور کاملیت کو حاصل کیا جائے، انسانی زندگی کی تکمیل اسی میں ہے، کہ نیم عورت اور نیم مرد کے حصے جو دنیس نے الگ کر کے اس دنیا میں بکھیر دئے تھے ان کو یکجا کر کے ایک حسین توانا اور صحت مند شخصیت کی نمو کی جائے اور انسانی زندگی کو حسن اور حسن کو دوام عطا کیا جائے۔ کیا ادب اور فن کا اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد ہو سکتا ہے؟

دوہے

جلیل حشمی

دُئی کی ماری، دیا جلائے دیکھ رہی ہے باٹ
جھلک جھلک جائے مکھڑے کے چاند میں پیلی لاٹ

اس کے وہ پردیسی، کاٹے برہ میں ہاڑ سے پوس
اس سے ہم بھی نہ ہنس بولیں تو کیا پاس پڑوس

مچھلی لے لو۔ ایک مچھیرن گلی میں ہانک لگائے
ہم جیتی رو ہو کے گاہک، کون اسے سمجھائے

ری گوری تجھے کیسی چنتا، تیری نند نہ ساس
نبجے نہ گجرا آنگن، پنگھٹ پر رہے ہے اداس

سادھو جی یہ مورتیں تج کر پھرتے ہو جن بن
ہاتھی گھوڑے کی سنگت میں ملیں گے کیا بھگون

گالوں پر لانبی پلکوں کے سائے پڑتے جائیں
حشمی جی! کیا بولیں، ہمیں تو بھول گئیں بھاشائیں

ایک چاند گگن کا ہے اور اک آنگن کا چاند
کوئی بتاؤ ان دونوں میں کون ہے من کا چاند

اپنے انگ لگا لو گوری جنم سپھل ہو جائے
دھول اڑاتا سوکھا پتا کنیل کمل ہو جائے

بھیڑ بھڑکا، ریلا دھکا، چور اچکا ہو
گوری ہم سے انگ بھڑا کر میلے میں چلیو

دیوی دیوتا کی پوجا تو کریں اپنے رام
گھٹ میں کون اتارے ہم سے چھٹ بھیوں کا نام

پیارے موہن ایسے میں اندھا جو پلک جھپکائے
چاند کی بیٹی، سورج کے سونے میں پڑی نہائے

رات گلی میں ملی تو پوچھا — کہاں چلی ری تو؟
بولی تجھی کو دیکھتی تھی لے باجرے کے لڈو

تم اک گاؤں کے اسکول میں چھوٹے سے استاد
کس پوتھی سے حشمی جی یہ دوہے کئے ہیں یاد

مکافات

منیب الرحمٰن

آؤ کہ میکدوں میں گزاریں تمام رات
تنہائیوں میں صحبتِ جام و سبو رہے
خاموشیوں میں کیفیتِ گفتگو رہے
یادوں کے پیچ و خم کو سنواریں تمام رات
زہرِ حیات دل میں اتاریں تمام رات

یہ در جو بند ہوں تو کہیں اور نکل چلیں
ظلمت بڑھے تو آتشِ غم تیز تر کریں
پروانہ وار جل کے بنیں خاکِ رہ نشیں
انبوہِ گرد و باد میں رقصِ شرر کریں
افتادگی میں آرزوئے بال و پر کریں

لے جائیں کس کے پاس یہ داغِ خود آگہی!
اے سوزِ ہجر، کوئی ترا رازداں نہیں
یہ شہرِ ناشناس، یہ ویرانیٔ ہجوم!
اس قافلے میں اہلِ نظر کا نشاں نہیں
سب اجنبی ہیں، کوئی یہاں ہمزباں نہیں

بیٹھیں شفق کے سائے میں خونِ جگر پئیں
آؤ کہ رسمِ اہلِ خرابات ہے یہی!
ہر عشقِ سخت جاں کی مکافات ہے یہی

ایک نظم

گوپال متل

جرم، گر حسنِ نظر ہے، تو گنہ گار ہوں میں
داورا! اس کے سوا میری خطا کچھ بھی نہیں
تھی نظر میں مری شادابیٔ جنت لیکن!
کتنی شاداب تھی وہ راہگزر کیا کہیئے

داورا! تیری مشیت کے تقاضوں کی قسم
واقعی، دل پہ بڑا جبر کیا تھا میں نے
مجھ کو معلوم تھا، آوارہ نگاہی کا مآل
لیکن اس شوخ کا افسونِ نظر کیا کہیئے

داورا! میری نظر میں ہے تری شانِ جلال
لیکن اے کاش دکھا دوں تجھے اس کا بھی جمال
داورا! کتنے دلآویز تھے اس کے خد و خال
اور پھر اس پہ مرا حسنِ نظر کیا کہیئے

بن باس

وحید اختر

رام کو جب بن باس ملا تو سیتا جی کا پیار بھی تھا
لچھمن ایسا بھائی سنگھاسن تجنے کو تیار بھی تھا
ان کے دکھ کو بانٹنے والے جنگل جنگل ساتھ رہے
پربت، پربت، صحرا صحرا، ان ہاتھوں میں ہاتھ رہے
چودہ سال کا اندھا جنگل ہنستے کھیلتے، کاٹ گئے
دکھ کٹھنائی. بوجھل گھڑیاں ہنس کر پیار میں بانٹ گئے

عہدِ اپٹک کے شہرِ تمدن کا اک بنجارا.
دوش پہ اسناد اور کتب خانوں کا بھاری پشتارا
نگری نگری، صحرا صحرا، مارا مارا، پھرتا ہے
دکھ کا ساتھی، سکھ کا ساجھی ڈھونڈے سے کب ملتا ہے
اس کو بھی بن باس ملا ہے، چودہ سال نہ سولہ سال
عمر تمام کی تنہا قید کے بوجھ سے زخمی، چور، نڈھال
لچھمن کو دنیا والوں نے دِرش کا جام پلایا ہے
سیتا کو جھوٹی اقدار کے بت پر بھینٹ چڑھایا ہے
اس کا اپنا دل بھی اس کو دیس نکالا دیتا ہے
اندھیاروں کے بازاروں میں کون اجالا دیتا ہے
رونے پر تعزیریں ہیں، فریاد پہ لب سی دیتے ہیں
ہنسنے ایسے جرم پہ ہونٹوں سے کلیاں چن لیتے ہیں

گھر کے بندھن ایسے ٹوٹے زنجیریں بھی ساتھ نہیں۔
اگلے زمانے کے لوگوں کی تقدیریں بھی ساتھ نہیں

علم کی جوت تعصب کی محرابوں میں دم توڑ گئی
اور یقیں کی مشعل ایک بھیانک موڑ پہ چھوڑ گئی
فطرت نے بن باس دیا، پر پیار دیا نہ رفاقت دی
جس کا پارکھ کوئی نہیں ہے، دل کی ایسی دولت دی

عہد اتینک کے شہرِ تمدن کا اک بنجارا
سنتا ہے اک مدت سے قزاقِ اجل کا نقارا
اس کے پاس ہے گھاٹے ہی کیا جو کوئی آ کر لوٹے گا
دل ٹوٹا ہے اتنی بار کہ پتھر سے کیا ٹوٹے گا
گہرے کھڈ میں گر نہ پڑے وہ، امید دامن تھام بھی لو
موت سے پھر وہ مان نہ جائے، سورج کی کرنو! دوڑو!
سیتا اس کا ہاتھ پکڑ کر راج سنگھاسن تک لے آئے
تب ہی یہ بن باس کرے گا، کوئی ذرا تو پیار جتائے
وہ اس کا خالق ہے، بھٹکا تو سب کی تباہی ہے
وہ انساں ہے جس کی ازل سے کل عالم پر شاہی ہے
اس کو یوں پیاسا تو نہ مارو، کون تمھیں امرت دے گا
اس کو پکارو — وہ تو اکیلا دنیا کا دکھ سہہ لے گا

سورج کی تلاش

وحید اختر

بہت حسیں ہے طلوعِ سحر کی جلوہ گری
شعاعِ نور سے ہے زخمِ شب کی بخیہ گری
گرہ کشائیٔ ظلمت شگفتنِ خورشید
وہ کیا کریں، نہیں تقدیر جن کی دولتِ دید
جو روز سوتے ہیں آنکھوں میں لیکے حسرتِ خواب
فراقِ دوست میں ہوتی ہے جن کی عمر خراب
چلو یہ مان بھی لیں، ہے ہر ایک شب کی سحر
مگر اجالوں میں بھٹکی جو شب گزیدہ نظر
تو چارہ سازیٔ فطرت پہ حرف آئے گا
نگاہ و دل کی شرافت پہ حرف آئے گا

اگر ہے پھر بھی یہ اصرارِ پیرِ میخانہ
کہ ہر سحر ہے نئی زندگی کا نذرانہ
وہ جن کی آنکھ کھلے فکرِ آب و دانہ سے
سحر کو مان بھی لیں ذکرِ غائبانہ سے

تو پھر دکھائیں کسے، دل ہے کتنے داغ لئے
تلاش کرتے ہیں سورج کو ہم چراغ لئے

ز کنارِ ما بہ کنارِ ما.....

وحید اختر

زباں بریدہ، نظر بند، دست و پا بستہ
ہجومِ عام سرِ رہ گزار ہے حیراں

گرسنگیٔ شکم، تشنگیٔ دیدہ و دل
ندیدِ چشمۂ حیواں کی فکر میں غلطاں

شمارِ سبحۂ انفاس و دھڑکنوں کا حساب
کچھ ایسا پھیر کہ حاصل ہے بس زیاں ہی زیاں

ہر ایک ہاتھ میں اعمال نامۂ یک عمر
مگر نہ داورِ محشر نہ عدل کی میزاں

ہر ایک آئینہ در دست خود نما خود بیں
مگر کسی کو کسی کی خبر نہ اپنا نشاں

ہے ایک عرصۂ عبرت یہ عالمِ برزخ
نہ زندگی ہی رفیق اور نہ موت ہی پرساں

میں اس ہجوم میں کس سے کروں سوالِ نظر
کسی کا دے گی پتہ کیا یہ بزمِ گمشدگاں

پلِ صراط پہ فرصت کسے کہ کان دھرے
مجھے یہ ڈر ہے اکارت نہ جائے میری فغاں

میں اپنے زخم دکھا دوں، مگر ہے یہ بھی یقیں
یہ لوگ بھی تو ہیں میری ہی نوع کے انساں

اگر مجھے ہے یہ فرصت کہ ان کا حال سنوں
مری نظر میں ہے وسعت کہ ان کا زخم سیوں
مرے قدم میں ثبات اتنا ہے کہ ساتھ چلوں
تو پھر مجھے بھی یہ حق ہے کہ ان سے بات کروں

وزیر آغا

"قرب و دور"

یہ قربت! یہ دوری!
جو سوچو تو ہیں کس قدر دور انجم
جو دیکھو تو جیسے گہر ہائے شبنم
کبھی گُل کے عارض پہ کچھ سیم پارے
کبھی چشمِ مضطر میں کچھ اشکِ پیہم

یہ قربت! یہ دوری!
جو پلکیں اٹھاؤ تو اک قربِ باہم
جو پلکیں گراؤ تو اک ہُو کا عالم
وہی آرزوؤں کے بجھتے شرارے
وہی دل — وہی دل کا صحرائے اعظم

پریم وار برٹنی

آرتی

کھلی ہوئی ہے مری زلف میرے شانے پر
دمک رہے ہیں ستارے گھنیری پلکوں میں
بجھے بجھے ہیں نظارے دھواں دھواں ہے فضا
تھرک رہی شبیہیں سی کچھ دھندلکوں میں
یہ کائنات ہے یا چاندنی کا عکسِ لطیف
یہ دل ہے یا کوئی سپنوں بھرا صنم خانہ
جھلک رہے ہیں نگاہوں میں رنگے رنگ کے روپ
ہر ایک روپ اجنتا کا نقش ہو جیسے
یہ راز آج زمانے سے میں کہوں کیسے

میں وہ زمین جسے آسمان پکارے گا
یہ ماہتاب مری آرتی اتارے گا

قاضی سلیم

یہ قربتیں یہ فاصلے

کل تک فصیلِ شہر کے اس پار جھیل میں
کتنے کنول تھے آج مگر ایک بھی نہیں
ویران ہو گئی ہے وہ خوابوں کی سرزمیں

یونہی میں چلتے چلتے یکایک ٹھہر گیا
اور دیر تک تمھارے تصور میں گم رہا
سوچا کہ تم نے مجھ سے کہا تھا کبھی یہیں
"شاید کنول کھلے ہیں اسی واسطے کہ تم
اک نظم کہہ لو اور انھیں جاوداں کرو"

مدت کے بعد درد کے پاتال سے تمھیں
اب میں جواب دوں تو بھلا کیا جواب دوں
کیسے کہوں کہ اپنے ہی فن کا رقیب ہوں

پھر بھی تمھارے پیار کے امکان سے پرے
ہر لطف و التفات کی آسودگی سے دور
جی چاہتا ہے تم سے فقط اتنا کہہ سکوں

"دیکھو فصیلِ رسم و روایت کی اس طرف
اک دل ہے جس میں جبیں کی گہرائیاں بھی ہیں
اس میں کھلے تو ہوں گے تمناؤں کے کنول
اب وہ شکیبِ دھیر کا اندھا کنواں سہی
ویران قبر ہی سہی، شہرِ بتاں سہی"

عمیق حنفی

جھوٹا سپنا

ایک سپاہی پڑا ہوا خندق میں سوچ رہا ہے
"میں نے اپنے دشمن کو بندوق کی زد پہ رکھا ہے
اپنے ملک کو جانے والا رستہ روک لیا ہے"
"اپنے شہر کے مکتب میں پڑھتا ہوگا میرا بیٹا
یا آنگن میں پیڑ کے اوپر چڑھتا ہوگا میرا بیٹا
دن دونا اور رات چوگنا بڑھتا ہوگا میرا بیٹا"
ایک سپاہی من ہی میں لڈو پھوڑ رہا ہے
"اور شہر کے گرجا گھر میں ابا جاتے ہوں گے
بوڑھی ماں کے لئے پھل اور دوائیں لاتے ہونگے
شام کو میری منی کو باہر ٹہلاتے ہوں گے"
ایک سپاہی جاگتے جاگتے سپنا دیکھ رہا ہے
"میری بیوی پیانو پر کوئی ٹیون بجاتی ہوگی
دیکھ کے فوٹو میرا بھیگی آنکھ چھپاتی ہوگی
یا پھر کلب میں ناچ کے اپنا جی بہلاتی ہوگی"
ایک سپاہی بھری ہوئی بندوق کو چوم رہا ہے

سونا

لب پہ تبسم آتے آتے سر میں اٹھا اک چکر
ہیڈ فون پر اس نے سنا وہ شہر ہوا خاکستر
اس کا وجود اب دیکھ رہے ہیں لوگ نقشے پر"
ایک سپاہی زور سے ہنس کر رو دی پکار رہا ہے

سامنے والی خندق میں تو سایہ بھی نہ ہلا تھا
کوئی گولی بھی نہ چلی تھی فائر بھی نہ ہوا تھا
کیا دشمن نے منتر پڑھ کر پھونک دیا تھا
میں تو رستہ روکے ہوں پھر یہ سب کیسے ہوا ہے

ایک دھماکہ سن کر میں بھی جاگ اٹھا، ٹوٹا سپنا
لیکن ذہن سے یوں چپکا تھا دیر نہ چھوٹا سپنا
ذہن کو جھٹکا دے کر میں چیخ اٹھا چھوٹا سپنا
اپنا راکٹ تو آکاش کے تارے نوچ رہا ہے

آج کی ملہار

عمیق حنفی

احترامِ اشاراتِ باراں کریں
دوستو سیرِ شہرِ نگاراں کریں
ابر سے چھائیں تن جائیں نیکر دھنک
دولتِ فکر و فن صرفِ یاراں کریں

آج ساری فضا ہے الف لیلوی
اور سچائیاں خواب گوں خواب گوں
جسم کے زیر و بم زلف کے پیچ و خم
بادلوں نے جگائے ہیں کتنے فسوں

لہر کھاتی ہے لے جسم میں ہر گھڑی
بادلوں کی سبھا بجلیوں کا نرت
خواب کی اک دھنک سے رنگ چھنک پڑی
آج سنسار ہے خوبصورت بہت

یہ گرج یہ تھرکتی ہوئی سرگمیں
یہ کھرج کی گمکتی ہوئی مرکیاں
یہ رکھب اور مدھیم کی تکرار میں،
چیخ پپیہے کی ہے پی کہاں پی کہاں

دو نکھادوں کو چھونے سے پہلے ابھی
رنگ کے مدھیم پہ پوچھیں کہ کب سے ذرا
میگھ ملہار کی جان — اتنا بتا
صاف ستھری تو ہوگی یہ کالی گھٹا

"قہر بر دوش و مہلک غبارِ فنا

تابکارانہ ذراتِ حشر آفریں

زر خریدِ جنوں عقلِ خونخوار کی

مہر برِ حرصِ ہوس اس پہ ہے یا نہیں"

بات یہ ہے کہ اہلِ ہوس ان دنوں پاس کے ساگروں میں محوِ جنوں

آزماتے ہیں اپنی بلاخیزیاں چھینٹ کر دامنِ امن پر رنگِ خوں

یہ گھٹا بھی ادھر ہی سے آئی نہ ہو

زہر دامن میں نادان لائی نہ ہو

اتنی تحقیق کر لیں تو آگے بڑھیں

ورنہ پھر دوستو جگ ہنسائی نہ ہو

نوٹ:۔ راگ میگھ ملہار میں رکھب اور مدھیم کی تکرار اور مدھیم پر قیام کرنے سے بادلوں کی گھن گرج اور برسات کا تاثر قائم ہوتا ہے۔ اس راگ میں دو نکھادیں یعنی کومل اور شدھ نکھادوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کھرج گرام کی مرکیاں بھی صوتی تاثر پیدا کرتی ہیں۔ رکھب سر بار بار مدھیم کو چھو کر جب ڈولتا ہے۔ تب واقعی بڑا لطف آتا ہے۔ اسی لئے رکھب کو اس راگ کی جان کہا جاتا ہے۔ عمیق

قیدی کی لاش

علی جواد زیدی

(مہا دیو دیسائی کی موت سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی)

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
ابھی نمودِ زندگی بسی نہ تھی نگاہ میں
ابھی دریچۂ سحر کھلا نہ تھا
ابھی فسونِ تیرگی مٹا نہ تھا
سکوت میں زمانہ تھا
ابھی گزر رہے تھے ہم جوارِ رزم گاہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
یہ خوفِ اشک و آہ تھا

یہ شامِ غم کا عکس تھا، یہ ایک انتباہ تھا
ستم گروں کے ترکشوں کا تیر تھا
مگر براہِ مصلحت
ابھی یہ چٹکیوں کے بیچ میں اسیر تھا
کہ اب گزر رہے تھے ہم نمائشِ سپاہ میں
ہجومِ اشک و آہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
ہمیں اسے کچل نہ دیں، ابھی یہیں

یہ روندنے کی چیز کیوں ہے، امانتِ زمیں

نہیں نہیں!

بڑھے چلو بڑھے چلو کچل بھی دو

خزاں کا غنچہ ہے یہ لاش اسے مسل بھی دو

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

یہ موت کا مجسمہ ڈرا رہا ہے دیر سے

لہو میں تر بتر ہے سر سے پاؤں تک

جمے ہوئے لہو میں ہے، مرے ہی خون کی مہک

کوئی عزیز تو نہیں

مگر کٹے ہوئے سروں میں کچھ تمیز تو نہیں

کوئی بھی ہو عزیز ہے،

کہ اس جری نے جان دی ہے جشنِ رزم گاہ میں

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

یہ دور اپنے آشرم کو چھوڑ کر

یہ اپنے ٹوٹے جھونپڑے سے اپنے منہ کو موڑ کر

یہ ظلم و جور کی بھری کلائیاں مروڑ کر

نکل پڑا

اندھیری رات تھی مگر یہ چل پڑا

کوئی بھی ہو عزیز ہے،

کہ اس جری نے جان دی ہے جشن رزم گاہ میں

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

زندگی ... جو آنیوالی ہے

شہریار

ازل اور ابد کی حدوں سے بہت دور
خاموشیوں کے
سمندر کے افسردہ ساحل سے
ٹکراتے صحرائیں دیکھو

بھٹکتی ہواؤں کے سیلاب میں
سر برہنہ صداؤں کے پیغامبر کھو گئے ہیں

کسی جاگتے سائے کی سونی آنکھوں میں
بیتے دنوں کے سسکتے سہارے،
کسی اونگھتی راہ کے سرد سینے کو
سہلا رہے

کسی ڈوبتے نقش کی روشنی میں
سلگتی پر اسرار سانسوں کی شہنائی کی
آرزو میں کوئی
سنگدل بت سے اس کا پتا
آج بھی پوچھتا ہے

ساقی فاروقی

خداوندِ خدا

اب زمیں اک نیا موڑ مڑنے لگی
بیکراں آسماں کی رقیب
اپنے ہاتھوں میں لے کر صلیب
اک نئی جست کے ساتھ اڑنے لگی
اور تم اپنے ماضی کے پُرپیچ رستوں میں گم
یاد کرتے رہو اہلِ شہر اس کے قہر
جس کے تابع نظامِ نجوم
ریگ زار اور بادِ سموم
سانس لیتے ہوئے تند و مواج بحر

ثور افگن

جلیل حشمی

ایک بار اور ایک بار
اس بلائے جاں کی وحشت کو ابھار
پھر بھڑک اے شعلۂ جوالہ! اے جانِ شرار

کس قدر ڈرتے ہیں لوگ
زندگی سے پیار بھی کرتے ہیں لوگ
تیرے ماتھے پر عرق پھوٹے، ادھر مرتے ہیں لوگ

یہ نشستوں میں دبکتے، سمٹے سمٹائے ہوئے
کالروں میں پھول اٹکائے ہوئے
ہونٹ لٹکائے ہوئے

حادثے دیتے ہیں تال
پھر ذرا انگوٹیں ردا لہرا اچھال
مسکرا کر موت کی ٹھنڈی کمر میں ہاتھ ڈال

میں بھی نغمہ گر ہوں تو بھی زندگی کا رقص کر
میں تماشائی نہیں ہوں دیکھ ادھر
رقص کر! جانِ شرار۔

رات کی باتیں

جلیل حشمی

تاش کی گڈی سے چن چن کر پتے کھڑے کیئے کئی گھر
اور یہ سوچوں، ان کے اندر کوئی دیا جلائے اگر
آتشدان میں اونگھتی راکھ سے یاد آئے خوشبو کا سفر

برسوں کے بچھڑے بچپن نے دھیرے دھیرے دی دستک
فرش پہ ریل مرے ننھے کی چلتی ہے چھک چھک چھک چھک
امبر پر تاروں کو چھو کر لوٹ رہی ہے وہی مہک

نیم کے نیچے چمک رہے ہیں دھانی بانکوں کے ٹکڑے
میرا زخمی ہاتھ بندھا ہے اک چنری کی دھجی سے
کس سے کہوں کوئی کیا سمجھے گا دنیا کیسی تھی پہلے

پھول اب بھی کھلتے ہیں، لیکن وہ بو باس نہیں آتی
لاکھ سہانی رات ہو لیکن اب تو راس نہیں آتی
ریکھا مری ہتھیلی کی اس خم کے پاس نہیں آتی

رنج نشاں ہیں خطوں کے فائل آتی نہیں کوئی آواز
اچھے مغنّی ہو تم یارو میرے نغمے میرا ساز
ڈھیلے ابروؤں والے کھول رہے ہیں میرے چاند کے راز

چھت میں آویزاں ہیں جالے، فرش پہ جمی ہوئی ہے دھول
یہ تصویر امر شہکار ہے، سر پہ کانٹے پاؤں میں پھول
جگ کے دیئے جلانے والے! کبھی ادھر کا رستہ بھول

آتشدان کی اونگھتی راکھ ہے کتنے لمحوں کا بستر
ایک عظیم الشان کھنڈر سے بہتر اک بستا ہوا گھر
کس دیوار پہ پٹخوں تنہائی کے زہر کا یہ ساغر؟

سرِ رہگزر

محبوب خزاں

وہ راہگزار جو گئی ہے
تیری ہی تلاش کو گئی ہے
کھیتوں میں چل رہا ہے پانی
رفتارِ خیال سو گئی ہے
دل ڈوب رہا ہے اک ستمگر
ساحل پہ پاؤں دھو گئی ہے
اب دیکھ رہا ہوں سوچتا ہوں
منزل ہے کہ راہ کھو گئی ہے
آئی ہے بہار بھی خزاں تک
اس کھیل میں جان تو گئی ہے

رہگزر کے بعد

میں سوچتا ہوں کہ اس رہگزر کے بعد ہے کیا
فضا تمام نظر ہے، نظر کے بعد ہے کیا
شبِ انتظار سحر ہے سحر کے بعد ہے کیا
دعا بڑے اثر ہے، اثر کے بعد ہے کیا
یہ رہگزر ہے تو اس رہگزر کے بعد ہے کیا

سید حرمت الاکرام

درد کی آگ

رات کا قافلہ آ کے ٹھہرا کہاں

وقت سہما ہوا زندگی مضمحل
چاند تارے خجل چاندنی منفعل
کتنے فریاد کرتے حقائق کا دل
اپنے ہی درد کی آگ سے مشتعل

دردِ شب کا ہوا ابھی مداوا کہاں
رات کا قافلہ آ کے ٹھہرا کہاں

جھلملاتی ہوئی کتنی پرچھائیاں،
گم ہیں لے کر اجالوں کی رعنائیاں

دورِ درد آشنا بے نام پہنائیاں
لے رہی ہیں خلاؤں میں انگڑائیاں

سحرِ خوابِ تمنا کا ٹوٹا کہاں
رات کا قافلہ آ کے ٹھہرا کہاں

قطعات

فضا کوثری

ریگ زارِ جہانِ بے معنیٰ سے — آدمی اس طرح گزر جاتا ہے
جیسے آندھی میں ریتلے رستے پر — ہر قدم کا نشان مر جاتا ہے

فضاؔ آئینہ ساز ہر چند چاہے — کہیں جڑ بھی سکتا ہے ٹوٹا نگینہ
جو ہم چاہتے ہیں وہ چاہے نہ قسمت — تو ساحل سے ٹکرائے ڈوبے سفینہ

دمِ سیرِ بستانِ حسنِ مجاز — نہ ہو چشمِ عرفاں اگر دل کے پاس
تو پھر جرم کیا ہے اگر آدمی ہو — چلا جائے اصنامِ باطل کے پاس

آپ اور مجھ میں از رہِ فطرت — فرق جو کچھ ہے عرض کرتا ہوں
عیش کے بل پہ آپ جیتے ہیں! — میں غمِ آرزو میں مرتا ہوں

سعیِ اخفائے محبت کا نتیجہ معلوم — میری صورت ہی بتاتی ہے مجھے غم ہے کوئی
گلِ پژمردہ مایوسِ بہاراں کی طرح — میرے ہونٹوں پہ جو رہتا ہے تبسم ہے کوئی

حصص از جاوید نامہ

ترجمہ: شفیق فاطمہ شعریٰ

فلکِ قمر

ہیں زمین و آسماں ملک اللہ
اپنی ہی میراث ہیں یہ مہر ماہ

رہگزر ہیں جو نظر آئے تجھے
دیکھ چشمِ محرمانہ سے اسے

اجنبی! پہچان لے اپنا دیار
اپنی بستی ہیں نہ بڑھ بے گانہ وار

زیرِ فرماں ہے، ترے یہ کائنات
تیرے امرِ کُن سے رقصِ ممکنات

کیا ہے عالم اک طلسمِ چشم و گوش
جس کا ہر فرد ہے فانی مثلِ دود وش

پھر طلب کے دشت میں آوارہ ہو
توڑتا چل توبہ نو اصنام کو

جب زمین و آسماں کو طے کرے
اس جہاں اور اس جہاں کو طے کرے

مانگ حق سے دوسرے ہفت آسماں
صد جہان و صد زمان و صد مکاں

تھک گئے پڑ رہنا لبِ جوئے بہشت
بے نیاز از حرب و ضرب خوب و زشت

نام اگر اس بے دلی کا ہو نجات
تب تو خوشتر خلد سے مرقد کی رات

اے مسافر موت ہے تجھ کو قیام
زندگی تیری ہے پروازِ مدام

ہم سفر تاروں کا ہونا خوب ہے
تھک کے راہوں میں نہ سونا خوب ہے

جادوئے رفتار سے سمٹی فضا
ہر بلندی کا حسیں ماتھا جھکا

خاکِ تیرہ بر سرِ قندیلِ شب
میرا سایہ مجھ سے اوپر، العجب!

ہر زماں نزدیک تر، نزدیک تر
آگیا آخر کہستانِ قمر

رومی:

سب گمانوں سے یہاں اب پاک ہو
خوگرِ رسمِ درہِ افلاک ہو

ہم سے رشتہ ہے پرانا ماہ کا | یہ ہے پہلا موڑ اپنی راہ کا

دیدنی ہے اس کا رنگِ روزگار
دیدنی ہیں اس کے غار و کوہسار"

ہُو کا عالم وہ کہستانِ خموش | پارہ پارہ سطح اور تہ میں خروش
خافقین دیلدرم کے کوہسار | ہر طرف لاوا اگلتے کوہسار
کوئی غنچہ ان میں مہکا ہی نہ تھا | کوئی طائر ان میں چہکا ہی نہ تھا
وہ دھنویں کی تہہ برساتی گھٹا | خاک افسردہ کو سہماتی گھٹا
عالمِ فرسودہ بے رنگ و صوت | نے نشانِ زندگی نے نقشِ موت
بطن میں اس کے نہ تڑپی تھی حیات | صلب تھی اس کی تہی از حادثات

مہر سے ملتا ہے اس کا بھی نسب
بے تغیر ہیں پر اس کے روز و شب

مجھ سے رومی نے کہا اٹھ دم نہ لے | دولتِ بیدار آنکھوں سے نہ دے
چاند کا باطن ہے ظاہر سے حسیں | اس کے ویرانوں میں ہے اک سرزمیں
تیز تر کر اور کچھ اب چشم و گوش | رکھ سدا بیدار اپنے عقل و ہوش
دیدنی ہر شے ہے گر بینا ہے تو | حیرتیِ عالمِ اشیا ہے تو
دامنِ رہبر نہ چھوڑ اے راہرو | سب سے اس کے ماسوا بیگانہ ہو

ہاتھ نرمی سے مرا تھامے ہوئے
مجھ کو لایا وہ قریب اک غار کے

عارف ہندی جو چاند کے ایک غار میں خلوت گزیں ہے اور اہل ہند اس کو جہاں دوست کہتے ہیں

ہاتھ رکھے ہم سفر کے دوش پر | غارِ تیرہ میں کیا میں نے گزر
اس کی ظلمت سے دل مہ داغ داغ | اس میں تھا سورج بھی محتاجِ چراغ
وہم و شک کا دل پہ نرغہ سا ہوا | لٹ گیا سرمایہ عقل و ہوش کا
گھات میں رہزن تھے میں چلتا رہا | دل تہی از لذتِ صدق و صفا

ناگہاں پردے اٹھے آئی نظر
بے طلوعِ مہر اک روشن سحر

ایک وادی نخل تھے جس کے بلند
سنگِ رہ جس کے تھے سب زنار بند

تھا نگاہوں میں جہانِ خاک و آب
یا خیالوں کا نگر یا شہرِ خواب

بادِ صحرا میں تھا بادہ کا سرور
چھو کے مٹی چھاؤں بن جاتی تھی نور

تھے نہ محصورِ فلک اس کے افق
ضو ہی ضو تھی، نے دھنک تھی نے شفق

نور ظلمت سے کبھی ہارا نہ تھا
واں کبھی ڈوبا کوئی تارا نہ تھا

زیرِ نخل اک ہند کا گیانی ملا
سرمۂ بینش تھی جس کی خاکِ پا

بال باندھے سر پہ اور عریاں بدن
گرد اس کے مارِ سیمیں حلقہ زن

ایک انساں، آب و گل سے ماورا
دہر اس کا پرتوِ تخئیل تھا

جگ کے ہر بندھن سے وہ آزاد تھا
کال کے چکر سے چھٹ کر شاد تھا

اس نے رومی سے کہا "یہ ہم سفر
کون ہے؟ پرسوز ہے اس کی نظر"

رومی:-

"اک جواں آوارہ اندر جستجو
اک ستارہ ثابت و سیارہ خو

خامیوں سے خام اس کا پختہ تر
اس کا سوزِ ناتمام اس کا ہنر

ذرہ اور پروازِ افلاکِ جلیل
اس کے اوجِ فکر میں گم جبرئیل

ایک شاہیں بہرِ صیدِ ماہ و مہر
رہ نوردِ جادہ ہائے نُہ سپہر

نغمہ کار جس نے صنم خانہ کہا
جو بھی کچھ کہنا تھا رندانہ کہا

کتنے شعلوں سے ہے پُر یہ موجِ دود
کبریا گیر اس کا اندازِ سجود

شوق سے ہر دم ہے نالاں مثلِ نے
سخت اس پر وصل بھی فرقت بھی ہے

جانے کیا شے اس کے آب و گل میں ہے
جانے یہ کس موڑ، کس منزل میں ہے"

جہاں دوست:-

جگت ہے رنگ اور رنگ ہے حق ماورا
کیا ہے جگ؟ ہے آدمی کیا؟ حق ہے کیا

رومی:

حق ہے اک تیغ آزما، تیغ آدمی — اور یہ جگ سان ہے اس تیغ کی
شرق کو دھن حق کی، دنیا سے نفور — غرب ہے دنیا میں گم اور حق سے دور
سوئے حق پیہم سفر ہے بندگی — خود پہ بے پردہ نظر ہے زندگی
بندہ جب ہو زندگی سے ہم کنار — اس پہ ہوتی ہے رہِ حق آشکار

جو نہیں آگاہِ تقدیرِ بشر
سوزِ جاں سے ہے تہی اس کی نظر

جہاں دوست:

"سرِّ ہست و نیست میں الجھا ہوا — مشرق ان رازوں سے ہے کم آشنا
کام ہم افلاک والوں کا ہے دید — میں نہیں فردا سے اس کے ناامید
کل نظر تھی سوئے اوجِ شمرود — اس پہ دیکھا اک فرشتے کا ورود
دید کی لذت تھی آنکھوں سے عیاں — ٹکٹکی باندھے تھا سوئے خاکداں
میں نے پوچھا کیا ہے اس جگ کی خبر؟ — محرموں سے پردہ کیا، سب کہہ گزر
کیا نظر آئی کوئی زہرہ ادا؟ — دل کہیں پھر چاہِ بابل میں پھنسا
وہ پکارا "شرق کو بیدار دیکھا — آفتابِ تازہ کو بیدار دیکھا
لعل اب اگلیں گے اس کے سنگِ راہ — یوسفوں کی جوت سے چمکیں گے چاہ
رستخیز نو سے ہے وہ ہم کنار — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار
آذری کے موڑ کو طے کر چکا — بت گری سے خودگری تک آ گیا
اے خوشا وہ قوم جس کی تاب و تب — ڈھالتی رہتی ہے اپنے روز و شب

عرش والوں کو ہے وہ دن روزِ عید
جب کسی ملت میں جاگے ذوقِ دید"

پیرِ ہندی اک ذرا پھر چپ ہوا — مجھ کو بیتابانہ دیکھا اور کہا
کیا ہے تن؟ — کی عرض "موجِ گردِ راہ"
کیا ہے رازِ روح؟ — رمزِ لا الٰہ

کیا ہے مرگِ عقل ؟ ترکِ فکرِ حق
کیا ہے مرگِ قلب ؟ ترکِ ذکرِ حق
کیا ہے آدم ؟ سرے از اسرارِ ہو
کیا ہے عالم ؟ وہ ہے خود ہی روبرو
کیا ہیں یہ علم و ہنر ؟ اک سطحِ دپوست
کیا ہے جنّت ؟ چہرۂ تابانِ دوست
عامیوں کا دین ؟ تقلید و خبر
عارفوں کا دین ؟ پروازِ نظر

سن کے یہ سب سوزِ جاں اس کا بڑھا
مجھ پہ کھولے تب یہ عقدے جانفزا

نو نکات از عارفِ ہندی

ذاتِ یزداں کا نہیں عالم حجاب ۱ غوطہ میں حائل نہیں ہے نقشِ آب
اک جہانِ نو میں اک تازہ جنم ۲ بخشتا ہے اک شبابِ تازہ دم
حق دراسے مرگ دعینِ زندگی ۳ فانیوں کو اس سے ہوگیا ؛ آگہی
ہم طیورِ بے مقام و بے نوا ہم سے علم مرگ میں کم ہے خرا
دقتِ شیرینیٔ زہر آمیز ہے ۴ مہرِ عالم گیر دُقہر آمیز ہے
قہر سے اس کے بھرے ہیں شہر دشت مہر اس کی کیا ہے جز رفتہ و گزشت
کافری ہے موت لے روشن نہاد ۵ مردہ سے غازی نہیں کرتے جہاد
مردِ مومن زندہ و باخود بجنگ خود غزال اور خود لہو پیتا پلنگ
کافرِ بیدار دل پیشِ صنم ۶ خوشتر از دیندارِ خفتہ در حرم
بے بصر ہے وہ جو دیکھے ناصواب ۷ شب نہیں پاتا کہیں بھی آفتاب

خاک سے پروانہ بنتا ہے درخت ۸ خاک کی صحبت سے انساں تیز بخت

خاک سے دانے نے پائی پیچ و تاب بہرِ تسخیرِ شعاعِ آفتاب

میں نے پوچھا پھول سے اے سینہ چاک ۹ کیسے پائے تو نے یہ انفاس پاک

جاں ہے تن میں بہرِ جذبِ این و آں جذب تیرا فاش، جذب اپنا نہاں

مردِ عارف چپ ہوا اور کھو گیا خود میں گم اور دور ہم سے ہو گیا

تیاگ کر مستی میں نیرنگِ شہود ہو گیا واقفِ تماشائے وجود

ذرے تھے مانند طور اس کے حضور بے حضور اس کے نہ نور و نے سرور

اک سراپا پھر ہوا صورت پذیر اس شبِ بے ماہ کا ماہِ منیر

سنبلِ جعدِ مسلسل تا کمر اس کی ظلمت سے منور دشت و در

جلوۂ مستانہ میں ڈوبا ہوا اک اچھوتے لحن سے نغمہ سرا

اس کے آگے ایک فانوسِ خیال محوِ گردش مثلِ چرخِ دیر سال

تھیں شبیہیں اس میں جولاں بے شمار شیر و آہو باز و بلبل، مور و مار

میں نے رومی سے کہا اے راہبر مجھ کو ان اسرار سے آگاہ کر

رومی ار

ہے یہ اندامِ منیرِ تابناک پر تو اندیشۂ یزدانِ پاک

کشتۂ تاب و تبِ ذوقِ نمود دھار کر روپ آ گیا سوئے وجود

خستہ و آوارہ و غربت سرشت اس کی اور اپنی ہے یکساں سرنوشت

شانِ جبریلی ہے نام اس کا سروش گہ مٹاتا، گہ جگا دیتا ہے ہوش

اپنے گل خنداں اسی شبنم سے ہیں دل میں شعلے اس کے سوزِ دم سے ہیں

شعر اس کو چھو کے پاتا ہے دوام پردۂ محمل اٹھانا اس کا کام

راگ میں اس کے ہے اک دنیا چھپی
تو بھی لے اس کی نوا سے روشنی

نوائے سروش

ہے کب سے تری کشتی غلطاں بہ سراب اے دل
ابھرا ابھی، مٹا بھی تو زیرِ حجاب اے دل

جب سرمۂ رازی کو آنکھوں سے بہایا تب
تقدیر اُمم دیکھی پنہاں بہ کتاب اے دل

ابرا کے نکل اور کوند کشت و تل و صحرا پر
کھا لیتے ہیں خود پیچاں بجلی کو سحاب اے دل

مغرب میں بہت ڈھونڈا، پایا نہ وہ صاحب دل
حد جس کے مقاموں کی ہو اور نہ حساب اے دل

بے دردِ جہانگیری وہ قرب نہیں حاصل
گلشن بہ گریباں بن، لے بو بہ گلاب اے دل!

ظاہر میں خودی فانی، ظاہر سے کچھ آگے بڑھ
طوفاں ہیں یہاں کتنے ظاہر میں حباب اے دل

مضراب سے فطرت کے یہ راگ نہیں پھوٹا
ہے خلد سے دور اک حور نالاں بہ رباب اے دل

علامت پسندی کی روایت۔ ایک تعارف

سی ایم بورا

ادب میں تحریکوں کا ذکر خطرناک ہوتا ہے۔ شاعرانہ وجدان کو ناپا یا تولا نہیں جا سکتا۔ شاعر کو کسی جماعت یا فرقہ سے منسوب کرنے یا اسے کسی کلیہ کی تعریف میں بطورِ نمونہ پیش کرنے میں خود شاعر کی پیچیدہ شخصیت ہمیں ناکام رکھتی ہے لیکن اگر ہم یورپ میں ۱۸۹۰ء سے پہلے جو شاعری کی گئی ہے اس کا موازنہ اس دور کے بعد کی شاعری سے کریں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دونوں میں کافی فرق ہے اور نئے شاعروں کے ہاں چند ایک چیزیں اس طرح مشترک ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ سب ایک ہی تحریک کے افراد ہیں، ان نئے شاعروں کے ہاں یہ مماثلت کسی طے شدہ منصوبے یا ارادی کوشش کی وجہ سے نہیں آئی ہے، اس کا موازنہ LAKE School یا PLEIADE کے لکھنے والوں سے نہیں کیا جا سکتا مگر یہ شاعر ان لکھنے والوں کی یاد دلاتے ہیں جو اپنے دور میں اپنے معاصرین سے ممتاز اور مختلف معلوم ہوئے لیکن آنے والی نسلوں نے ان سب کے ہاں اس دور کی ایک ہی مخصوص چھاپ دیکھی جس طرح ہم آج دیکھتے ہیں کہ بائرن پشکن اور ہیوگو کے ہاں چند ایسے خصائص مشترک ہیں جو آج شاعری سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں، بالکل اسی طرح شاعروں کی اس نسل میں جو ۱۸۹۰ء میں ہوش کو پہنچی کچھ ایسی دوسری خصوصیتیں ہیں جو انھیں اپنے پیشروؤں سے اور موجودہ لکھنے والوں سے الگ اور ممیز کرتی ہیں، ہم جس تحریک کا ذکر کر رہے ہیں، وہ اپنی توانائی تقریباً ختم کر چکی ہے۔ اس تحریک کے قابلِ ذکر نمائندے مر چکے ہیں، اس کے افکار و مقاصد زنگ خوردہ ہو گئے ہیں، اب یہ تحریک تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہے اور اب وقت آیا ہے کہ اس کے مقاصد اور کامیابیوں کا تجزیہ اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے

اس تحریک کو ان شعری سرگرمیوں کی دوسری لہر سمجھنا چاہیے، جنھیں کبھی علامت پسندی اور کبھی انحطاطی شاعری کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ حالانکہ یہ دونوں نام قطعی نہیں ہیں اور ان سے قطعیت کا مطالبہ عموماً ناکام رہتا ہے، ہر شعری تحریک اپنے نمائندوں سے پہچانی جاتی ہے اور علامت پسندی کے نمائندہ شاعر بودلیئر، ورلین اور ملارمے تھے، بودلیئر ان تینوں میں پہلا شاعر تھا جس نے علامات کی اہمیت کو قدرِ اول کی حیثیت دی، ورلین نے علامات کو فطری طور پر استعمال کیا اور ملارمے نے علامات کی تشریح اور جواز میں ایک مابعد الطبیعاتی نظام کی

تعمیری کھڑی کر دی ۔ ملارمے کے نظریات اور عمل میں علامت پسندی کی تحریک اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی تھی، اس تحریک کے ذکر کے ساتھ ہی ہمارے ذہنوں میں ملارمے کا نام اور اس کے افکار زندہ ہو جاتے ہیں، لیکن اگر بودلیئر نہ ہوتا تو ملارمے کی شاعری بھی وجود میں نہ آسکتی تھی اور اگر ورلین ملارمے کے نظریات کو عام قبول پیرائے میں نہ پیش کیا ہوتا تو ملارمے کو شکل ہی سے کوئی مقام مل سکتا تھا، ایک دوسرے سے نمایاں طور پر الگ ہوتے ہوئے بھی ان تینوں شاعروں کے زندگی کو دیکھنے کا زاویۂ نظر ایک تھا اور یہ چیز انھیں اپنے پیش رووں سے ممیز کرتی تھی، علامت پسندی اپنے مختلف رجحانات کے باوجود ایک بنیادی مسلک پر متحد تھی اور اسی مسلک نے علامتی شاعری کا کردار متعین کیا ۱۸۹۰ء کے بعد آنے والوں کو یہ مسلک ورثہ میں ملا اور انھوں نے لے اپنا لیا، چند ایک نے اسے ترک کیا، دوسروں نے اسے کچھ ایسی نئی شکلوں میں ڈھالا جو تقریباً ناقابل شناخت تھیں یا پھر اس رستے سے ہو کر بیان و اظہار کے اپنے خاص اسالیب بنالئے ان سب نے علامتی نظریات کی صداقت اور توانائی کی شہادت دی اور ان لوگوں کی تخلیقات یہ بتاتی ہیں کہ بظاہر وقتی اور محدود نظر آنے والے نظریے سے بھی مختلف اور متنوع نتائج پیدا کئے جا سکتے ہیں، کئی زبانوں اور دور دراز کی سرزمینوں میں ایک فرانسیسی نظریہ کو عملی شکل دی گئی اور ان تجربات کے تنوع اور کامیابی سے ظاہر ہوتا ہے کہ فنون لطیفہ میں ایک نظریہ کتنا اہم ہو سکتا ہے، بشرطیکہ نظریہ کو فارمولے کے طور پر نہیں بلکہ ایک نئے تجربہ کے لئے بنیاد کے طور پر استعمال کیا جائے۔

ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے فرانس میں علامت پسندی کی تحریک بنیادی طور پر متصوفانہ تھی، مذہب پر روایتی عقیدے سے محروم عہد کے سائنٹفک آرٹ کے خلاف اس تحریک نے پر زور خطابت کے ساتھ احتجاج کیا اور صداقت کی تلاش میں اس عقیدے کا بدل ڈھونڈنے کی سعی کی، اس دور کے نمائندے زولا کے جیسے ناول نگار تھے، جو معاصر زندگی کے وسیع کینوس پر بے رحم تفصیلات کے نقوش رقم کر رہے تھے یا پھر ہیریڈیا کی طرح کے شاعر تھے جو گزری ہوئی صدیوں اور دور افتادہ مناظر کی نیم تصویریں پیش کر رہے تھے، اس آرٹ میں مذہب یا تصوف کی کوئی گنجائش نہیں تھی، حقیقت نگاروں کو حواس کے دائرے سے آگے کسی اعلیٰ اور برتر دنیا پر اس عقیدے کی ضرورت نہیں تھی، جس سے اگسٹائن کے نو افلاطونی نظریات کو قبول کرنے کے بعد یورپ شناسا ہو چلا تھا، ان لوگوں کا یہ مضبوط عقیدہ تھا کہ صداقت سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور یہ صداقت صرف اسی دنیا کے تجربات میں ڈھونڈی اور پائی جا سکتی ہے، اگرچہ راسخ العقیدہ عیسائیت بھی اس دور میں موجود تھی اور اس عقیدہ کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک طبقہ بھی موجود تھا، لیکن یہ لوگ اس عہد کے نمائندے نہیں تھے، انیسویں صدی کے تیسرے ربع میں فرانس میں حقیقت نگار اور PARNASSIANS ، ادبی میدان پر قابض تھے، انگلستان میں بھی اسی

قسم کی طرزِ فکر براؤننگ کی ڈرامائی نظموں اور ٹینی سن کی "شہزادی" کی SHORT, SWEET, IDYLL قسم کی ان نظموں میں بھی نمایاں ہے جو اشیا اور اشخاص کے تذکرہ میں بالکل خارجی اور ہر طرح کی داخلیت سے مبرا ہیں۔

اس سائنسی حقیقت نگاری کے خلاف علامت پسندوں نے احتجاج کیا۔ اس احتجاج کے پس پشت ایک ایسی مثالی دنیا پر یقین تھا جو ان کے نزدیک حواس کی اس دنیا سے کہیں زیادہ اصلی تھی، اپنی معنوں میں اس دور میں علامت پسندی کی تحریک متصوفانہ تھی گو اسے صحیح معنوں میں عیسوی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سچ ہے کہ ورلین اپنی زندگی کے ایک دور میں ظن و تخمین سے محفوظ مضبوط عقائد پر قائم رہا، بودلیئر کی "ابلیسیت" کیتھولیسزم ہی کی بدلی ہوئی شکل تھی، ملارمے نے کلیسا کی رسوم اور مذہبی شعائر سے کافی مواد لیا لیکن علامت پسندی کا متصوفانہ کردار ان ظواہر سے کہیں زیادہ عیسویت سے دور تھا۔ یہ لوگ دراصل "حسن مطلق" کے مذہب کے پیرو تھے، جس کا اظہار بودلیئر، ورلین اور ملارمے تینوں کے ہاں ملتا ہے، اس "حسن مطلق" کو تضاد کے ذریعہ ظاہر کرنے کے لئے بودلیئر کا خود اپنی زندگی کو اندوہناک طور مقابل میں پیش کرنا، ورلین کی جسم اور روح کے متوازی خطوط پر لکھنے کی کوشش، ملارمے کے ناقابل فہم الہامی جملے، یہ سب اسی کا اظہار تھے بودلیئر کے ہاں اس حسن مطلق کی لگن نے اس کی پریشان اور غم رسیدہ روح کو ایک مقصد اور قوت عطا کی، ورلین کے ہاں یہ لگن ممنوعہ مسرتوں کی تلاش کا جواز بن گئی اور ملارمے کیلئے اول و آخر ہی "حسن مطلق" تھا۔ ان لوگوں کے عیسوی عقائد مسخ اور متزلزل ہو چکے تھے اور ایک نعم البدل کی ضرورت کے احساس کے تحت انھوں نے اس "حسن" میں کوئی ایسی چیز دریافت کر لی تھی جس نے انھیں ایک نقطہ پر متحد کر کے ان کی کاوشوں کو ایک سمت اور مقصد بخش دیا تھا۔ حواس کے دائرے سے آگے ایک دنیا پر ان کا یقین، دیگر ہر عقیدے سے مکمل بے نیازی اور اپنے عقیدے سے ان کی شدید اور جذباتی وابستگی ایسی تھی کہ اسے صرف متصوفانہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو علامت پسندی جمالیات پرستی ہی کی ایک متصوفانہ شکل تھی اور انگلستان کی جمالیاتی تحریک اسی تحریک کا دوسرا روپ تھا جس کے علم بردار راسٹی اور پیٹر تھے اور آسکر وائلڈ جس کا شہید تھا۔ "مثالی حسن" پر یہی ایمان راسٹی کی پوری شاعری میں رسا بسا ہوا ہے، اس عقیدے نے اس کی کتاب "HOUSE OF LIFE" میں محبت کا بڑا عجیب تصور پیش کیا ہے اور مذہبی موضوعات تک اس کے احاطہ میں آ گئے ہیں جو نظریات راسٹی کے فن میں زیر سطح کارفرما نظر آتے ہیں ان کا براہ راست اظہار پیٹر کی RENAISSANCE کے مشہور و معروف آخری باب میں ملتا ہے، آسکر وائلڈ کی تباہی اور زوال

کے لئے لعنت و ملامت کا جو طوفان کھڑا کیا گیا تھا وہ صرف آسکر وائلڈ کے اخلاقی جرم پر غم و غصہ کا اظہار نہیں تھا بلکہ لوگوں کے عامیانہ پن اور بد مذاقی نے اپنے دشمن کی شکست پر جشن منایا تھا، وائلڈ جس مسلک کا علم بردار تھا اس سے یہ لوگ ڈرتے اور نفرت کرتے تھے، وائلڈ کو جو سزا ملی تھی وہ نہ صرف اس کی زندگی کے لئے تباہ کن تھی بلکہ اس سے جمالیات پرستی کی بنیاد پر ضرب پڑتی تھی، اس واقعہ نے آرٹ اور فن کو بدنام کر دیا تھا، اور اس کے بعد ایڈورڈین عہد کے شعراء ایک کٹے ہوئے طبقہ کی حیثیت اختیار کر گئے، معاصر فکر کے بنیادی دھاروں سے ان کا رشتہ کٹ گیا اور یہ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منتشر ہو کر الگ تنہائی میں کام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ "چار سالہ جنگ" تک یہی صورت حال رہی اور اس کے بعد کہیں جا کر انگلستان میں شاعروں کو دوبارہ قومی زندگی میں اپنا روایاتی مقام و مرتبہ ملا

لیکن فرانسیسی علامت پسندی کے مقابلہ میں انگریزی جمالیات پرستی اتنی زیادہ نظریاتی، ریاضت طلب اور متصوفانہ نہیں تھی، اور نہ راسکن اور پیٹر نے ملارمے کی طرح خوبصورتی کے بارے میں نظریہ بازی کو اتنی خطرناک منطقی حد پہنچایا تھا، جمالیات پرستوں نے مذہب اور اخلاقیات کے دائرے میں جو باطنی تجربات ممکن تھے ان سے کہیں زیادہ گہرے اور جاندار تجربہ کا عرفان فن اور آرٹ میں ممکن بنا لیا تھا، انھیں معلوم تھا کہ وہ کس آدرش کی پرستش کر رہے تھے، انھیں اپنے آدرش کا علم تھا اور ان کی زندگیاں فطری اور مخلص تھیں، ان کے ایقانات اور نظریات واقعی انقلابی تھے، ان نظریات نے نہ صرف ان کے معاصرین کو دہشت زدہ کیا بلکہ انگریزی کلچر کا پورا کردار ہی بدل کر رکھ دیا، ایک طرح سے یہ لوگ بھی مذہبی ہی تھے کیونکہ انھیں احساس تھا کہ "خوبصورتی" کی تلاش، زندگی کو مربوط و متحد بنا کر اسے ایک معنویت بخشتی ہے، یہ لوگ ملارمے کی طرح تصوف زدہ نہیں تھے. اور ان کے نظریات اتنے ماورائی اتنے مکمل اور سخت گیر تھے، یہ لوگ ارتسامات کو ان کی اصلی شکل میں قبول کرنے پر قانع تھے، ان ارتسامات کو تخیل کی رنگ آمیزی سے بڑھا چڑھا کر ایک برتر اور مثالی کائنات میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتے تھے، شاید پروٹسٹنٹ انگریز کی فطرت کسی بھی مابعد الطبیعاتی نظام یا تصوف کی مکمل اطاعت سے طبعاً گریز کرتی ہے. پیٹر کی جمالیات پرستی اپنی نوعیت میں تجرباتی اور داخلی تھی وہ اپنے سارے ارتسامات کو ایک ترتیب سے ان پر فکر کرتا اور ان سے اپنے نظریات کی تشکیل کرتا تھا، لیکن اس کے اخذ کردہ نتائج نظریاتی کم اور عملی زیادہ ہوتے تھے، میرے خیال میں اس نے شاید اپنے دور کی فکر اتنا متاثر نہیں کیا جتنا لوگوں کے اعمال و کردار کو، اس کی تعلیمات نے یقین و اعتقاد کا محور تلاش کرنے والے کئی لوگوں کو ایک نیا آدرش بخشا. اور عظیم تبدیلیوں کے واسطے راستہ ہموار کیا، جانسن اور ڈاؤسن جیسے انیسویں صدی کے اواخر کے کئی ایک

شعلو پر پیٹر کا بہت اثر تھا لیکن اس کا عظیم ترین شاگرد جیراڈ ہوپکنس تھا، جس کی شعری زندگی پر انگلستان اور یورپ کا کوئی فکری دھارا اثر انداز نہیں ہو سکا تھا، پیٹر نے ایک ایسے دور میں شعر و ادب کو عزت و احترام کے قابل بنایا جب ان کی قدر و قیمت گر چکی تھی اور شعر و ادب سے بدگمانی اور بدظنی عام تھی لیکن بایں ہمہ پیٹر کے تصورات ملارمے کی طرح اتنے پیچیدہ اور متصوفانہ نہیں تھے۔

ملارمے نے یقیناً ادب کے ایک تصوف کی ایجاد کی تھی جس کا بے ربط اظہار وہ بہت پر اسرار اور شاندار الفاظ میں کرتا رہا، اس کے نظریات کا ماحصل یا خلاصہ پیش کرنا ناممکن ہے اور اس کوشش میں اس کے اصل نظریات بالکل مسخ ہو جاتے ہیں، کیونکہ ملارمے نے مخصوص موضوعات پر جیشا استعاروں اور تشبیہوں میں اظہار خیال کو ترجیح دی ہے لیکن ان سے ان کے بنیادی نظریات اور طریقۂ کار کے بارے میں ضروری معلومات اخذ کی جا سکتی ہیں اور انھیں میں علامت پسندی کے اہم ترین نکات ملتے ہیں، مثلاً "DIVAGATIONS" میں ایک جگہ پھول کا ذکر کلیدی حیثیت رکھتا ہے، ایک جادو کے لفظ سے ظاہر ہو جانے والا یہ پھول ایک مثالی پھول ہے، اس میں سارے پھولوں کی خوبصورتی ہے لیکن یہ خود ہر ایک پھول سے الگ اور بلند کوئی اور ہی چیز ہے ملارمے جس چیز کو "IDEE" (خیال) کہتا ہے وہ بہ یک وقت ایک مخصوص معیار بھی ہے اور ایک عالمگیر اصول بھی "وجود" نہیں بلکہ "حسن" ملارمے کیلئے "حقیقت کل" تھا، خوبصورتی سے بھری ہوئی اس دنیا میں ملارمے نے (LES IDEES) خیالات میں ایک ایسا تخلیق کرنے اور سہارا دینے والا ذریعہ تلاش کر لیا تھا جو نہ صرف بالذات خوبصورت بلکہ دوسرے اشیا کی خوبصورتی کا باعث بھی تھا PROSE, POUR DES ESSEINTES میں بھی اس نے تقریباً اسی نظریہ کا اظہار کیا ہے، یہاں بھی جس پھول کا ذکر آیا ہے، وہ ایک مثالی پھول ہے اور اس کی خوبصورتی، صرف خالص نظر کے لئے ہے، حواس کے لئے نہیں۔

اس قسم کے نظریہ میں مذہبی شاعروں کے نظریات کی بہت ساری باتیں مشترک ہوتی ہیں، ملارمے نے جس طرح نظم میں "حسن مطلق" کو اسیر کرنے کی کوشش کی، اسی طرح ڈانٹے نے ایک غیر مرئی دنیا کا مرئی پیکر تلاش کرنے کی کوشش کی تھی اور اس پیکر کی تخلیق میں جس طرح ڈانٹے کو جنت اور دوزخ کی مسلمہ عیسوی علامات کو استعمال کرنا پڑا اسی طرح ملارمے کو بھی علامات استعمال کرنے پڑے، اس کے پیروؤں کو بجا طور پر علامت پسند کہا جاتا ہے، کیونکہ ظاہری اشیا کی زبان میں ایک فوق الفطری تجربہ کی ترسیل ہر لفظ کو ایک علامت بنا دیتی ہے اور الفاظ اپنے عام معنوں میں استعمال ہونے کی بجائے ایک ماورائی حقیقت اور اس کے تلازمات کی نشاندہی کے لئے استعمال ہوتے ہیں، ملارمے کا یہ طریقہ نیا نہیں تھا، بلیک کی الہامی نظموں اور متصوفانہ ادب میں اس کی

مثالیں عام ہیں لیکن یہ فرق ضرور تھا کہ ابتدائی علامت پسند مذہبی عقیدت کے موضوعات کو برتتے تھے اور ان کے برعکس ملارمے کو ایک خاص جمالیاتی تجربے سے دلچسپی تھی۔ اسی تجربہ کا اظہار اور اس کی تفسیر وہ بالکل اسی انداز میں کرتا تھا جس انداز میں ایک صوفی دیدارِ حق کی کیفیات بیان کرتا ہے۔ اس معاملے میں بھی ملارمے کا ایک پیش رو تھا بودلیئر نے اپنے سانیٹ "CORRESPONDANCES" میں فطرت کو کسی اور حقیقت کی علامت کے طور پر پیش کیا تھا۔ بودلیئر کے لئے یہ کائنات ایسی آیات سے معمور تھی جو قلب انسانی کو غم و نشاط کی کیفیات سے پر کر دیتی ہیں اور رنگ، آواز و بو کے ذریعہ انسان کو روحانی ابتہاج و سرمستی کے عالم میں پہنچا دیتی ہیں۔

علامت پسندی کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نظریہ ایک مثالی حسن رکھنے والی کائنات کے وجود پر اصرار کرتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کائنات کا عرفان فن اور آرٹ کے ذریعہ ممکن ہے۔ علامت پسندوں کا دعویٰ تھا کہ مذہبی آدمی عبادات و مراقبہ کے ذریعہ جس بے خودی اور سرمستی کی کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں وہ کیفیات شاعر کو اپنے تخلیقی عمل کے دوران میں میسر آجاتی ہیں۔ ان کا یہ بلند دعویٰ بہت زیادہ غلط بھی نہیں تھا کیونکہ عبادت میں مکمل یکسوئی اور انہماک سے غرق ہو کر آدمی جس زمان و مکان سے ماورا سکون و طمانیت سے آشنا ہوتا ہے، وہ چیز ایک خالص جمالیاتی تجربہ سے حاصل ہونے والی اس بے خودی کی کیفیت سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی، جس میں غم و نشاط، وقت و مقام اور اپنے پرائے کی ہر تفریق ختم ہو جاتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ سینٹ جان دی کراس کی شاعری کیف و وجد کا جو عالم طاری کر دیتی ہے وہ فی الواقعہ مذہبی ہے یا جمالیاتی، کیونکہ اس میں ملٹن کی استدلالی اور منطقی مذہبیت کا دور تک پتہ نہیں چلتا بلکہ اس شاعری کی کیفیت اس سرور و انبساط سے زیادہ قریب ہے جو شاعروں پر تخلیقی عمل کے دوران طاری ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں جمالیاتی سرمستی مذہبی خشوع و خضوع کی کیفیت سے مماثل ہو سکتی ہے کیونکہ جو لوگ اس دنیا کے آگے ایک اور دنیا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں ان کیلئے اس دنیا تک پہنچنے کے طریقے ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

لیکن ایک بنیادی بات ایسی ہے جو فرانسیسی علامت پسندوں کو روایاتی علامت پسندوں سے الگ کرتی ہے کلیسا کے پاس اس کی اپنی شاندار علامات تھیں جو وقت کے ساتھ مقدس اور قابل تعظیم بن گئی تھیں اور صدیوں سے مذہبی آرٹ میں مستعمل ہونے کی وجہ سے عام فہم تھیں۔ عیسویت کی علامات اپنے تلازمات میں بہت زرخیز اور آسانی سے قابل شناخت ہیں۔ لیکن جو شاعر اپنی ذاتی اور نجی کیفیات کا اظہار کرنا چاہے اسے اپنی علامات تلاش کرنی پڑتی ہیں اور یہ علامات دوسروں کے لئے آسانی سے قابل فہم نہیں ہوتیں۔ بودلیئر نے اس مسئلہ کا یہ حل نکالا تھا کہ کیتھولیسزم کی علامات کو اٹھا کر انھیں اپنی محبوبہ اور اپنی ذات کے لئے استعمال کرنے لگا، لیکن ملارمے

کونئی علامات دریافت کرنی تھیں اور اس نے اپنے مختلف اور متنوع تاثرات کے دائرے سے یہ علامات منتخب کیں، ملارمے کی تصنیفات کے بغور مطالعہ کے بعد یہ علامات بڑی حد تک سمجھ میں آجاتی ہیں، کچھ علامتیں مبہم رہجاتی ہیں اور چند ایک ایسی ہیں جو شاعر کے مافی الضمیر کو ظاہر نہیں کر پاتیں اسی وجہ سے ملارمے کی شاعری دنیا کے کسی بھی عظیم شاعر کی شاعری سے کہیں زیادہ مشکل ہے یہ شاعری اپنے قارئین سے ایسے علم کا مطالبہ کرتی ہے جس کا مکمل حصول تقریباً ناممکن ہے، لیکن جہاں علامات سمجھ میں آجاتی ہیں (اور زیادہ تر علامات قابل فہم ہیں) وہاں ان کے ذریعہ وہ ماورائی اہتزاز و مسرت حاصل ہوتی ہے جس کا احساس ملارمے کو اپنے شعری عمل اور وجدان میں ہوتا تھا اور ان کیفیات کی یہ ترسیل کسی اور ذریعہ سے اس سے بہتر طور پر نہیں ہو سکتی تھی کہیں کہیں نظموں کے مجمل نقوش دھندلے بھی ہیں تو مرکزی رنگ اتنے تیز اور واضح ہیں کہ پوری تلافی ہو جاتی ہے اور الفاظ میں عام سطح سے ہٹے ہوئے ایسے تجربات کا بیان ہوا ہے جو کسی اور ہی دنیا کی چیز ہیں، اور جن کا تعلق اس عالم وجود سے ہے جس کے لئے الفاظ تراشے ہی نہیں گئے

علامت پسند ایک خاص شدت احساس کی ترسیل کرنا چاہتے تھے اور اس کی لگن میں انھیں شاعری کی کئی مسلّم خصوصیات سے انحراف کرنا پڑا، سب سے بڑی چیز تو یہ تھی کہ انھوں نے تمام سیاسی اور سماجی موضوعات کو اپنے لئے ممنوعہ بنا لیا تھا جو کہ اس زمانہ میں رومانیوں کو بہت عزیز تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر خلوص اور شدت احساس ہوں تو سیاسی شاعری کی بھی ایک اپنی عظمت ہوتی ہے، سیاسی شاعری کی کمزوریاں لازماً اس کے موضوع کی عطا کردہ نہیں ہوتیں لیکن مثالی حسن اور خوبصورتی کی دھن میں کھوئے ہوئے علامت پسندوں کے لئے سیاست بے حد نامطبوع موضوع تھا، سیاست کا شور و غل ان کی غور و فکر کی مقدس خاموشی کے لئے بہت گراں تھا، سیاسی موضوعات کا بازاری پن ان کے تصور کی یکسوئی اور لطافت کو غارت کر دیتا تھا علامت پسند آرٹ کے سائنٹفک یا حقیقت پسند نظریے سے بھی متنفر تھے کیونکہ یہ نظریہ تو اس مثالی دنیا کی بنیاد ہی ڈھا دیتا ہے جو ان کے فکر و عمل کا مرکز و محور تھی۔ پارنے سین تحریک میں ان کے چند ایک ساتھی درست ضرور تھے لیکن ورلین اور ملارمے کبھی بھی اس تحریک سے منسلک نہیں رہے ان کے لئے وہ فن بہت زیادہ سائنٹفک تھا، ان کا مقصد اس مرئی دنیا کے مناظر کی بازآفرینی تھی اور ملارمے وغیرہ کا مطمح نظر کچھ اور تھا، گو ملارمے پارنے سین کے رسالے میں چھپتا ضرور تھا، لیکن بہت جلد ظاہر ہو گیا کہ اس کی اصلی جگہ وہاں نہیں تھی وہ شاعری آنکھوں کو دعوت دیتی تھی جب کہ ملارمے کی شاعری پنہاں خواہشات، ہیجانات، تنہائی کی لذت اور خاموش ذاتی فکر کو انگیز کرتی تھی

علامت پسندوں کی طاقت ان کی ایک آدرش سے لگن میں پوشیدہ تھی اسی چیز نے انھیں مذاق اور خلوص

کی ان ناکامیوں سے بچا لیا جو ٹینی سن اور ہیوگو کے یہاں پڑھنے والوں کو خوف زدہ کر دیتی ہیں۔ ان کی کائنات تنگ سہی لیکن اس کی زرخیزی ناقابل تردید ہے، کیونکہ "نادیدہ" کی حدود نہیں مقرر کی جا سکتیں اسی لئے یہ امر تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی آمد کو ایک انقلاب سمجھ کر اس کا خیر مقدم کیا گیا اور ایسے شاعر بھی ایک عرصہ تک ان کے پرچم کے نیچے لڑتے رہے جو نہ علامت پسندوں کے مقاصد سے واقف تھے اور نہ ان کے طریقۂ کار سے یہاں ایسی شاعری تھی جس میں خلوص بھی تھا اور جو احساسات کو بیدار بھی کرتی تھی۔ یہاں بے جان خطابت اور خشک پند و نصائح نہیں تھے، عوام سے کوئی اپیل نہیں تھی، سوائے "خوبصورتی" کے اور کسی مقصد سے کوئی سروکار نہ تھا۔ علاوہ ازیں علامت پسندوں نے شاعری کو دوبارہ ان خصائص سے مزین کیا تھا جو مفقود ہو چکی تھیں اور جو لوگ شاعری کا درک رکھتے تھے انہوں نے اس خوشگوار تبدیلی کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے شاعری کو وہ داخلی عنصر بخشا جسے پارنے سینس نے گھر نکالا دے دیا تھا، یہ سچ ہے ملارمے نے آرٹ کو غیر شخصی قرار دیا تھا لیکن خود اپنے غیر معمولی تصورات سے وابستہ رہ کر اس نے ظاہر کر دیا کہ شاعری کے لئے "ذات" بھی اتنا ہی زرخیز موضوع بن سکتی ہے، جتنا لزلی کے ہاتھی یا ہیریڈیا کے زیرہ دریا عجائبات۔ علامت پسندوں نے بتایا کہ شاعری مرصع اور ذاتی دونوں ہو سکتی ہے یہاں مشتعل اور پرجوش نوجوان شاعروں کو اپنے بارے میں لکھنے کا وسیلہ نظر آرہا تھا اس نئے طریقے نے جو احساس کے ہر پہلو کے اظہار کے لئے موزوں تھا، ان نوجوانوں کو خود اظہاری کا راستہ بتایا، یہ بھی کم اہم بات نہیں تھی کہ علامت پسند شاعری میں موسیقیت کے بہت زیادہ قائل تھے ویگنر کی موسیقی ان کے دور کا بہت بڑا انکشاف تھی، ملارمے اور دیرلین دونوں ویگنر کے مداح تھے، ویگنر کی موسیقی کا پر وقار آہنگ ان کے کانوں کے لئے ایک نئی چیز تھا، اس موسیقی میں انھیں وہی کیفیت نظر آئی جو وہ اپنی شاعری کے ذریعہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ موسیقی ان کے لئے بنیادی چیز بن گئی، والیری نے کہا کہ علامت پسندوں کا بنیادی کام یہ ہے کہ شاعروں کی گم کردہ موسیقیت دوبارہ موسیقی سے واپس لائی جائے۔ اس کام میں یقینی دشواریاں اور پیچیدگیاں تھیں، لیکن وقتی طور پر بہت خوشگوار امیدیں اور توقعات پیدا ہو گئیں، کم از کم فرانسیسی شاعروں کو تو یہ ایک عظیم الشان مہم معلوم ہو رہی تھی، ویگنر نے موسیقی میں نشانات نغمہ میں جو تبدیلی پیدا کی تھی اسی طرح شاعری میں الفاظ کا استعمال نہ صرف ممکن بلکہ ضروری بھی معلوم ہو رہا تھا، فرانس کے باہر انگلستان اور جرمنی میں بھی اس رجحان کا خیر مقدم ہو رہا تھا اور اسے گیتوں کی کھوئی ہوئی روایات اور شاعری کی اصل روح کی طرف مراجعت سمجھا گیا

اس مسئلے نے ملارمے کو بہت عرصے تک منہمک رکھا، شاعری کو کیا ہونا چاہئے کا ایک معیار اپنے سامنے رکھکر

اس نے کافی غور و خوض کیا، اس غور و فکر کے بعد اس نے جو نظریہ قائم کیا اس کا اجمال یہ ہے کہ شاعری کا کام معلومات بہم پہنچانا نہیں بلکہ اشارہ کرنا ہے، چیزوں کے نام بتانا نہیں بلکہ اُن کی فضا تخلیق کرنا ہے، یہ نئی بات نہیں تھی۔ ملارمے کے ہیرو ایڈگر ایلن نے کہا تھا "مبہم کا ابہام اور غیر قطعیت ایک روحانی تاثر پیش کرتے ہیں" ابہام کے ذریعے شاعری میں اسراری کیفیت پیدا کرنا بہت اعلیٰ مقصد تھا۔ اور کئی ایک شاعر اپنے اپنے انداز میں اس کی کوشش کر چکے تھے اس لئے ملارمے کا مطالبہ کوئی اچھوتی بات نہیں معلوم ہوا لیکن ملارمے نے اس نظریے کا جان توڑ استقلال سے پیچھا کیا۔ اس کی شاعری HERODIADE کی نیم مبہم پراسرار شوکت سے ہوتے ہوئے UN COUP DE DES کے عجیب غریب آخری حصے تک پہنچتے پہنچتے اپنے ابتدائی دور کا سادہ واضح پن کھو کر مکمل ابہام اور پیچیدگی کی نذر ہو گئی۔ UN COUP DE DES کے آخری حصے میں تو صفحات پر الفاظ کی جائے اور ترتیب خود الفاظ سے کہیں زیادہ اہم ہو گئی ہے، جو پراسرار کیفیات اسے محسوس ہوتی تھیں ان کو دوسروں تک پہنچانے کی دھن میں اس نے الفاظ کی ساخت اور ترتیب اپنے طور پر کی، اوقاف اور اعراب کو کم سے کم کر دیا اور بعض اوقات نحوی قواعد سے بھی روگردانی کی، گو ان میلانات نے لوگوں میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی تھی لیکن جہاں تک ملارمے کے مرکزی مقصد ابہام و ایمائیت کا تعلق تھا، اس کے مقابلے میں یہ باتیں زیادہ اہم نہیں تھیں ملارمے کے لئے کسی چیز کی فضا، تاثر اور اس کی روح خود اس چیز سے کہیں زیادہ اہم تھی وہ تشبیہات اور موازنے کے قدیم وسیلوں کو مسترد کر کے اپنے موضوع کو کسی بھی مماثلت رکھنے والی چیز سے ملا دیتا ہے، کیونکہ اس طرح موضوع اپنے اصلی نام سے کہیں زیادہ بہتر طور پر اپنی معنویت کی ترسیل کر سکتا ہے، اس کی ایک مثال دیکھئے۔ ایک سانیٹ میں وہ تاروں بھرے آسمان کا ذکر کرتا ہے۔ عام طور پر لوگوں نے اس منظر سے آدمی کی بے بضاعتی کا احساس قبول کیا ہے۔ لیکن ملارمے کا تصور یہ نہیں ہے، اس کے لئے فضائے شب کی وسیع پہنائی بھوتوں کا محل ہے جس کا فانوس اور جس پر پڑے ہوئے پھولوں کے ہار خالص جھوٹ سے بنے ہیں، آسمان کو خدا کا محل بتانے والے سارے خیالات کو ایک تارک الدنیا راہب کے مغرور خواب قرار دینا بہت انفرادیت پرستانہ بات ہے وہ خدا یا آسمان کا نام نہیں لیتا بلکہ اس کی بجائے اس عالیشان محل کو اس کے مرجھائے ہوئے پھولوں سمیت نظروں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے، ساری شرح و شرحات، وضاحتیں اور ۔ موازنے یکسر چھوڑ دئے گئے ہیں، صرف ضروری نکات بیان کر دئے گئے ہیں، اس طرح ارتکاز اور تاثیر میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے اس میں موسیقی کا براہِ راست متاثر کرنے والا جادو شامل ہو گیا ہے۔ ابتدا سے آخر تک نظم شعریت کا ایک مکمل پیکر ہے ہر قسم کی بے کیف خشکی اور جھول سے مبرا، ملارمے کے ہاں بار بار اس کامیابی کا اعادہ ہوا ہے، کسی بھی دوسرے فرانسیسی شاعر نے اس کی طرح اتنی خالص اور

مکمل شعریت سے بھرپور مصرعے نہیں کہے

ملارمے نے فرانسیسی شاعری میں گہرائی اور لطافت کو جس طرح سمیٹ لیا ہے اس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی، دیگر کی مثال سے کم از کم اتنا تو فائدہ ضرور ہوا۔ ابہام کا طریقہ اپنے ساتھ ایک خاص فائدہ لایا، انسانی شعور میں بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لئے سیدھا سادھا بیانیہ اظہار نا مکمل نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے ہم سب ان نامعلوم گریزاں ذہنی کیفیات سے آگاہ ہیں جن کا کوئی واضح خاکہ یا نقش نہیں ہوتا اور جو بہت کم معرض اظہار میں آسکتی ہیں لیکن ملارمے کے طریقۂ کار میں ایسی کیفیات شاعری میں بیان کر دی جا سکتی ہیں، مثلاً ایک نظم میں وہ ایک عاشقانہ مہم کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کامرانی کے احساس پر نظم کا اختتام ہوتا ہے، اس نظم کو قطعی مفہوم دینے کی کئی کوششیں کی گئیں۔ بعض نے کہا کہ شاعر گاڑی میں گھومنے کے لئے نکلا ہے اور ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں گاڑی کے پہیئے سرخ نظر آرہے ہیں۔ کچھ نے کہا شاعر آتش بازی کی نمائش والے چکر کی ایک قسم کی طرف اشارہ کر رہا ہے، در اصل یہ سب ایک ایسی جگہ قطعیت ڈھونڈھنے کی کوشش کی ہے، جہاں قطعیت سرے سے ہے ہی نہیں، شام کے جھٹپٹے میں ایک کامران رتھ کی تصویر کامیابی کے سرور و انبساط کی ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے اور بس۔ اس نظم کا مدعا بھی یہی ہے اور اس نظم نے اسے بے حد کامیابی کے ساتھ پورا بھی کیا ہے

لیکن ملارمے صرف اشارہ کرنے پر قانع نہیں تھا، موسیقی کو اس نے صرف ایک نمونے کے طور پر نہیں لیا تھا، کسی طرح اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ شاعری ایک قسم کی موسیقی ہے، اس کے معنے اس کے نزدیک یہ نہیں تھے کہ شاعری اور موسیقی سے حاصل ہونے والا حظ اپنی کیفیت اور کمیت میں ایک دوسرے سے مماثل ہے۔ حالانکہ اس کے نظریہ سے یہ مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے، اس کے پاس ایک متصوفانہ اعتقاد تھا جو سب سے بڑی چیز تھی، اسے جمالیاتی مسرت کی ایک ایسی وحدت کا علم تھا جو فکر کی رسائی سے پرے اور با معنی الفاظ سے ماورا تھی اس کا آدرش ABSENCE کا تھا ایک کاملیت جو کبھی وجود پذیر نہیں ہوتی ایک سناٹا جو نغمہ سے زیادہ مترنم اور شیریں تھا، وہ کاملیت کے اس سراب اور اس سناٹے کے گیت کو اسیر کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک نظم SAINTE میں ایک ولیہ رنگین شیشے کے دریچے میں بیٹھی ہوئی ایک فرشتے کا پر چھو لیتی ہے اور یہ پر ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے جیسے وہ کوئی ساز ہو اور ولیہ اپنا بربط پھینک کر MUSICIENNE DE SILENCE "خاموشی کی مغنیہ" بن جاتی ہے۔ ملارمے نے ایک آسمانی موسیقی کے خواب دیکھے ایک ایسا نغمہ جو حسن مطلق کی شکل میں روحانی کانوں کو سنائی دیتا ہو اس کے لئے نظم کے معنے تھے

DE SCINTILLATIONS SILOT LE. SEPTUOR

"کہکشانی آوازوں کا سرگم"۔ ان سنا نغمہ، خاموش لفظ، یہ ملارمے کے اس وجد وانبساط کی علامات تھیں جو اسے اسقدر عزیز تھیں اور جن کی عظمت سے وہ دوسروں کو بھی آشنا کرانا چاہتا تھا۔ ملارمے کو یقین تھا کہ وہ جو بھی شاعری کرے گا اس میں ایک ایسی ماورائے سخن مطلق و مکمل شعریت ہوگی جو اس کی لکھی ہوئی شاعری سے بلند و برتر ہوگی، اس نے سخن سنجی اور کمال سخن پر ہمیشہ ماورائے سخن والی بات کو فضیلت اور ترجیح دی

اکثر لوگ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ جمالیاتی مسرت ہیں بعض اوقات ایک ایسا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے جس کا اس جمالیاتی مسرت دینے والے فن پارے سے کوئی قابل فہم تعلق نظر نہیں آتا، ایک ایسی خالص خوشی جو الفاظ کے معانی سے آزاد ہوتی ہے اور اپنی اسی نوعیت کی وجہ سے اس کیفیت سے قریب ہوتی ہے جو موسیقی سے حاصل ہوتی ہے۔ ملارمے کو اس کا علم تھا اور اس نے اس چیز کو اپنے عقائد کا مرکز و منتہا قرار دے لیا تھا اسے امید تھی کہ وہ شاعری کو اس طرح منزہ کر دے گا کہ اس سے خالص نشاط و مسرت حاصل ہو سکے ایک ایسی مطلق اور مکمل مسرت جو الفاظ پر فطرت کی طرف سے عائد کردہ تمام قیود اور حد بندیوں سے آزاد اور ماورا ہو اور ایک دوسری برتر و اعلیٰ دنیا کی چیز معلوم ہو

تو یہ ظاہر ہوا کہ علامت پسندی اپنی اصل میں متصوفانہ قسم کی شاعری تھی جس کی تکنیک کا انحصار اس کی مابعد الطبیعات پر تھا اور اس کی ابتدائی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ اس نے شاعر کی ذات کو اہمیت دی اور شاعری میں موسیقی کے عناصر پر اصرار کیا۔ اس کا دائرۂ اثر کئی ملکوں تک پھیل گیا اور کئی لوگ اس تحریک کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہوگئے، لیکن علامت پسندی کے متعلق ان زریں توقعات کے پیچھے کئی خامیاں اور کمزوریاں بھی تھیں، گو یہ خامیاں بنیادی یا مہلک نہیں تھیں، لیکن آگے چل کر ان کے مہلک نتائج ضرور نکل سکتے تھے، علامت پسندوں نے عامیانہ جذبات سے اپنا رشتہ توڑنے اور شخصی اور نجی تصورات سے پیمان جوڑنے کا جو معمولی قدم اٹھایا تھا اس کے نتیجہ میں وہ زندگی کے ایک بہت بڑے حصہ سے الگ ہوگئے اور ان کا کام تربیت یافتہ، ذوق رکھنے والے چند ایک مخصوص افراد تک محدود ہوگیا، سیاسی طور پر اس کی وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ جمہوری خیالات کے بڑھتے ہوئے دھارے کے خلاف یہ تحریک امارت کا ردعمل تھی۔

اور یہ وضاحت حقیقت سے زیادہ دور بھی نہیں ہے، ولیر کی قسم کے لوگوں کی اپنی عالی نسبی کے متعلق بچاؤ نگیں اور پھر دیگز کا حلقہ بویریا کے لڈوگ دوم کے حلقے سے الگ نہیں تھا۔ علامت پسندوں کی عوام سے نفرت فلابیر سے کم نہیں تھی

ملارمے سمجھتا تھا کہ ایلین پو ہانڈرا کے ہاتھوں مرا۔ اس کا عہد اپنے جمہوری مزاج کی وجہ سے اسے اپنا

دشمن معلوم ہوتا تھا، لیکن زندگی سے یہ دوری معزول اور معتوب امرا کی علیٰحدگی پسندی سے کہیں زیادہ تارک الدنیا جوگیوں کی خلوت گزینی سے قریب تھی، یہ تنہائی پسندی ان تقاضوں کا نتیجہ تھی جو جمالیاتی احساس اپنے شناسا ترین سے کرتا ہے، ایک سچا جمالیات پرست جو اپنے ارتسامات کو بڑھانا اور احساس کے موہوم اور تیز یا خفیف ترین ارتعاشات کو گرفت میں لانا چاہتا ہو وہ زندگی کے غیر شاعرانہ تقاضوں اور جد و جہد سے کٹ جاتا ہے۔ اپنے مقاصد سے اس کی یہ سچی اور مخلصانہ لگن ایسی تنہائی اور یکسوئی کا مطالبہ کرتی ہے جو بیشتر لوگوں کے لئے ناممکن ہے، جمالیات پرستوں کی اس خلوت گیری کو علامت پسندوں نے اپنا بت بنا لیا اور اس کی مکمل تعبیر انھیں HUYSMAN کے ناول A REBOURS کے ہیرو میں مل گئی جو دنیا سے بھاگ کر اپنے آپ کو کسی ایک ایسے گوشۂ عافیت میں چھپا دینا چاہتا تھا جہاں غیر تغیر پذیر زندگی کی گرفت آوازیں اس کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں، ایسے نظریہ کی انتہا کیا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ دلیر کے AXËL سے ہو سکتا ہے جس میں اصل زندگی کچھ بھی نہیں اور تخیلی تجربہ ہی سب کچھ ہے زندگی گزارنا؟ AXËL چیخ کر کہتا ہے "یہ تو ہمارے خدمتگار ہمارے لئے کر لیں گے"۔ اس ذہنیت کی انگریز جمالیات پرستوں کے پاس بھی کمی نہیں ہے۔ پیٹر کو ایسے تخیلی ہیروؤں کے بارے میں خیال آرائی کرنا پسند تھا جو زندگی کی کسی ذمہ داری کو قبول کرنے تیار نہ تھے اور اس خیال آرائی سے اس نے سباستین وان اسٹارک کی تصویر پیدا کی جس کی نازک مزاجی کو کوئی قیود اور حدود قبول نہیں تھے۔ اس نازک مزاجی اور نفاست پسندی نے شاعری اور زندگی کے درمیان ایک خط فاصل قائم کر دی

ایک تو نئے شاعروں کو عوام سے نفرت تھی، اس کے ساتھ جب عوام نے ان کی شاعری کو بھی اپنی سمجھ سے بالا پایا تو ان کی توجہات نچلے درجے کے ادیبوں کی طرف مبذول ہو گئیں اور لکھنے والے عوام سے کٹ کر اور زیادہ اپنے آپ میں محصور ہونے لگے اور اس طرح اس قوت اور توانائی سے محروم ہو گئے جو گلیوں اور بازاروں سے ملتی ہے انہوں نے ایک ملک یا نسل کی بات نہیں کی بلکہ خود اپنے بارے میں لکھتے رہے۔ جہاں ان پیغمبروں نے وائلڈ اور پیٹر کی طرح اپنی تعلیمات کو عوام میں مقبول بنانے کی سعی کی وہاں انھیں اس کی بڑی مہنگی قیمت دینی پڑی۔ پیٹر کو اس کے بیشتر معاصرین زندگی بھر شک و شبہہ کی نظروں سے دیکھتے رہے، وائلڈ نے عوامی داد حاصل کرنے کی خواہش میں اپنے فن کے بڑے حصے کو خراب کر لیا، فرانس میں علامت پسندوں کو مقبولیت کی تلاش نہیں تھی انھیں بورژوازی کی تضحیک اور تحقیر مقصود تھی، انھیں اپنے دور سے زیادہ آنے والی نسلوں سے توقعات تھیں کہ وہ انھیں ان کا صحیح مقام لیکن چونکہ انھوں نے اپنے عہد سے منہ موڑ لیا تھا اس لئے آنے والی نسلوں پر بھی ان کا کوئی حق نہیں رہا ان کے ہاں اکثر اس قوت اور توانائی کا فقدان ہے جو زندگی کے تعلق سے پیدا ہوتی ہے اور اپنی پائدار انسانی خصائص کی وجہ

سے صدیوں زندہ رہجاتی ہے ایک شاعر کے لئے ایک محدود حلقہ میں خواہ وہ کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو زندگی گزار دینا آسان نہیں ہوتا، ایک طرف اس کے فیضان کا سرچشمہ خشک ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، دوسری طرف اپنے کام کی ناقدر دانی کا احساس اسے ناکامی اور مایوسی کا شکار بنا سکتا ہے، اپنے فن کے بارے میں ضرورت سے زیادہ غور و فکر کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فن کو عملی طور پر برتنے کے قابل نہ رہے، بلکہ ملارمے کے ساتھ یہی المیہ ہوا جس "خالص تخلیق" کا خواب اس نے بیس سال تک دیکھا وہ پورا نہ ہو سکا اور اس کی اس قابل افسوس ناکامی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی تخلیق اور نظریۂ تخلیق کے بارے میں سوچتے ہوئے اتنے برس نکال دئے کہ اس عرصہ میں اس کی قوت کے سرچشمے خشک ہو گئے

REMY DE GOUMONT کا خیال شاید سچائی پر مبنی تھا کہ ملارمے نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لی بلکہ ملارمے نے شاعری کے اصول اور نظریے پر اتنا غور و فکر کیا کہ اس کے لئے کسی اور بات پر سوچنا ممکن نہیں رہا جس وقت اسے کسی ایک نظم کی تفصیلات تیار کرنے میں معروف ہونا چاہئیے تھا اس وقت وہ صرف یہی سوچ سکتا تھا کہ ایک مثالی نظم کیسی ہونی چاہئیے۔

ملارمے کے نظریے کی ایک دوسری شکل یہ تھی کہ اس نے موسیقی کو بے انتہا اہمیت دے رکھی تھی۔ دیگزی کی کامیابی کا تصور اس پر مستولی ہو گیا تھا، اور اس نے مختلف طریقوں سے یہ کامیابی نظم میں لانے کی کوشش کی، اس کوشش میں ملارمے اکیلا نہیں، پیٹر نے جب یہ کہا کہ "ہر آرٹ کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ موسیقی کے درجہ کو پہنچ جائے" تو در اصل سیدھی سادھی انگریزی میں وہی بات دہرا رہا تھا جو ملارمے کئی بار کہہ چکا تھا لیکن دونوں کے بیانات کو بہت زیادہ لفظی معنوں میں نہیں لینا چاہئیے پیٹر اور ملارمے دونوں محسوس کرتے تھے کہ شاعری میں الفاظ کے معانی ایک ناقابل حل مشکل پیش کرتے ہیں، کیونکہ معانی کی وجہ سے الفاظ شاعری میں موسیقی کی طرح خالص جمالیاتی تاثر نہیں پیدا کر سکتے لیکن ملارمے موسیقی کی مثال سے یقیناً مغالطے کا شکار ہو گیا ہے، وہ یہ سمجھنے لگا تھا وہ شاعری میں ایک ایسا خالصتاً جمالیاتی اثر پیدا کرے گا کہ تفہیم کا سوال ہی ملتوی ہو جائے گا، کیونکہ تلازمات اور صوتی اثرات سارا کام کر لیں گے اور الفاظ کے مفہوم سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، لیکن الفاظ کا تعلق خیالات سے ہے اور شاعری الفاظ سے بنتی ہے اس میں خالص تصور کی لامحدود وسعت کبھی نہیں آسکتی ملارمے ایک ایسے مطلق حسن کے افسوں میں گرفتار تھا جو اس کے لئے سب کچھ تھا، اس حسن کو اس نے کئی علامتوں میں متشکل کیا، نیلا آسمان، سحر، برفیلی چٹانیں، اور یہ ساری علامتیں بتاتی ہیں کہ یہ حسن غیر شخصی، جامد اور بعید شے ہے، ان صفات کی ترسیل کی اس نے جان توڑ کوشش کی لیکن وہ جس کیفیت کی ترسیل کرنا چاہتا تھا وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جس پر ایک پوری نظم لکھی جا سکے الفاظ کو ان

کے مفاہیم محدود بنا دیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مترنم اور نغمہ خیز شاعری بھی موسیقی کے مدارج کو نہیں پہنچ سکتی، ملارمے کے نظریے کا جواز پیش کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن حقائق ملارمے کے خلاف ہیں۔

اپنے فن کے بارے میں اس کا اپنا اعتراف، اپنی عظیم نظم لکھنے میں ناکامی، اس کی طرف سے صفائی پیش کرنے والوں کا یہ ثابت نہ کر سکنا...... کہ شاعری ایسے تاثرات پیدا کر سکتی ہے جن کا موسیقی کے تاثرات سے موازنہ کیا جا سکے اور یہ ناقابل تردید سچائی کہ الفاظ معانی سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ ان تمام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملارمے کا نظریہ ناقص تھا، عام زندگی سے قطع تعلق اور موسیقی کو شاعری کا مقصود منتہا قرار دے لینا ملارمے کی شعری زندگی کی سب سے اہم اور نمایاں کمزوریاں تھیں اور شاید یہی کمزوریاں تھیں جن کی وجہ سے اس کی موت کے بعد فرانس میں علامت پسند ناکام ہو گئے اور پال والیری نے جو صحیح معنوں میں ملارمے کا جانشین تھا ان دونوں مشکلات کا سامنا کیا اور ان کے مفہوم کو سمجھا لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں غلط میلانات کا ایک اثباتی پہلو بھی تھا، ایک میلان نے شاعری کو زندہ اور توانا احساس کا عطیہ بخشا تو دوسرے نے شاعری میں صوتی اثرات کی اہمیت کی طرف توجہ مبذول کرائی اور جدید دنیا کو علامت پسندوں کی شاید یہ سب سے پائدار دین تھی۔ دونوں کی مشکلات بہت زیادہ ہیں اور علامت پسندوں کے وارثوں نے اسی طرف اپنی زیادہ تر توجہات صرف کیں، درحقیقت وہ شاعر جو ۱۸۹۰ء کے بعد اس روایت کے زیر اثر لکھ رہے تھے انہیں مجبوراً اپنے مرصع اسالیب کو ترک کر کے گوشۂ عافیت کے ہاتھی دانت میناروں سے اتر کر عوامی زندگی سے رشتہ جوڑنا پڑا۔ ان لوگوں نے حسن مطلق کے دائرے میں زیادہ لچک اور وسعت پیدا کی اور اس کے دوران میں وہ اپنے طریقۂ کار اور نظم کے متعلق اپنے خیالات کو بدلنے پر مجبور ہو گئے۔ انہی تبدیلیوں اور اخذ و قبول کی وجہ سے ان لوگوں کی شاعری خاص طور پر توجہ طلب ہے کیونکہ شاعری کی زندگی تغیر اور تبدیلی میں ہے ایک بار ایک اسلوب مکمل ہو جائے تو اسے ترک کر دینا چاہیئے کوئی اور چیز ایک عظیم اسلوب سے اتنا دور نہیں ہوتی جتنا اس اسلوب کا چربہ اصل سے دور ہوتا ہے، علامت پسندوں کے ورثا نے اس یقین کے ساتھ ابتدا کی تھی کہ ملارمے کے نظریات صحیح تھے، لیکن ان سب نے کسی نہ کسی شکل میں ان نظریات کو ترک کر دیا، اس سے ملارمے پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ اپنے آرٹ کے بارے کسی شاعر کے نظریات کو ان کی عالمگیر سچائی کے معیار سے نہیں جانچنا چاہیئے بلکہ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ ان نظریات نے شاعری کی تخلیق کو کیا طاقت اور توانائی بخشی، آج اگر ورڈز ورتھ، ہوریس اور دو بیلے کی طرح ملارمے کے نظریات بھی مسترد ہو چکے ہیں تو اس سے ملارمے مورد الزام نہیں ٹھہرتا بلکہ وہ تحسین و توصیف کا مستحق ہے کیونکہ اس کے نظریات نے تخیلات اور اذہان کو روشنی اور کام کرنے کی تحریک بخشی اور آنے والوں کیلئے اپنی اپنی مخصوص طبائع کے مطابق نشو و نما پانے کے راستے میں رکاوٹیں نہیں پیدا کیں۔ (ترجمہ: محمود ایاز)

افسانہ "فیصلہ" بقیہ ص ۱۶

اب میں آپ کو بستر پر لٹا دوں گا، یقیناً آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آیئے میں آپ کو کپڑے اتارنے میں مدد دوں گا آپ دیکھیں گے میں مدد کر سکتا ہوں۔ یا اگر آپ ابھی سامنے کے کمرے میں چلے جائیں اور فی الوقت میرے بستر پر لیٹ جائیں تو سب سے اچھی بات ہوگی۔"

جارج اپنے باپ سے لگ کر کھڑا ہوا تھا اور اس کے باپ نے اپنا الجھے ہوئے سفید بالوں والا سر اپنے سینے پر جھکا رکھا تھا۔

"جارج" اس کے باپ نے بھی آواز میں جنبش کئے بغیر کہا۔

جارج فوراً اپنے باپ کے بازو دو زانو ہو گیا۔ بوڑھے آدمی کے تھکے ہوئے چہرے پر پھیلی ہوئی پتلیاں اسے آنکھوں کے کنارے سے برابر گھورے جا رہی تھیں۔

"پیٹرز برگ میں تمہارا ایک دوست ہے۔ تم ہمیشہ دھوکا دیتے ہو اور تم نے مجھے بھی دھوکا دینے میں جھجک نہیں محسوس کی، پیٹرز برگ میں تمہارا دوست کیسے ہو سکتا ہے! میں اسے نہیں مان سکتا۔"

"ذرا پرانی باتیں یاد کیجئے ابا" جارج نے اسے کرسی سے اٹھایا اور وہ کمزور قدموں پر کھڑا ہوا تو اس کا ڈریسنگ گاؤن اتارتے ہوئے کہا، "ابھی کوئی تین سال ہوتے ہیں جب میرا دوست گزشتہ بار یہاں آیا تھا مجھے یاد ہے آپ اسے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، کم از کم دو بار تو میں نے آپ کو اسے دیکھنے سے باز رکھا حالانکہ وہ میرے کمرے میں بالکل میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ آپ کی میرے دوست کو ناپسند کرنے کی وجوہات میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کیونکہ میرے دوست میں عجیب و غریب عادتیں ہیں۔ لیکن پھر بعد میں آپ میرے دوست سے گھل مل گئے تھے اور مجھے فخر محسوس ہوتا تھا کہ آپ اس کی باتیں سن کر سر ہلاتے تھے اور اس سے سوالات کرتے تھے، آپ اگر پچھلی باتیں یاد کریں تو وہ آپ کو یقیناً یاد آ جائے گا۔ مثال کے طور پر جب وہ ایک کاروباری دورے پر کیو گیا ہوا تھا تو فسادات میں پھنس گیا اور وہاں اس نے دیکھا کہ ایک بالکونی پر ایک راہب نے اپنی ہتھیلی کو چیر کر صلیب کا نشان بنایا اور لوگوں کو یہ ہتھیلی دکھا کر جھگڑے سے باز آنے کی تلقین کی، آپ نے خود بھی یہ واقعہ دو ایک بار سنایا ہے۔"

یہ باتیں کہنے کے دوران میں جارج نے اپنے باپ کو دوبارہ بیٹھایا اور اس کی وولن پتلون اور موزے اتارے، اس کا زیر جامہ کچھ میلا سا تھا جسے دیکھ کر جارج نے باپ سے اپنی اس لاپروائی پر اپنے آپ کو ملامت کی یقیناً یہ اس کا فرض ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنے باپ کے پاک صاف زیر جاموں کی تبدیلی کا خیال رکھتا۔ اس نے ابتک اپنے ہونے والی بیوی سے کوئی واضح گفتگو نہیں کی تھی کہ مستقبل میں اس کے باپ کے بارے میں کیا

انتظامات کئے جائیں کیونکہ دونوں نے خاموشی کے ساتھ فرض کر لیا تھا کہ بوڑھا آدمی پرانے گھر میں اکیلا اسی طرح بسر کرے گا، لیکن اب جارج نے فوری اور مضبوط فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے ہونے والے نئے گھر میں باپ کو بھی ساتھ رکھے گا، قریب سے دیکھنے پر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنے باپ کو جو آرام پہنچانا چاہتا ہے شاید اس کا موقع بھی نہیں ملے گا۔

وہ اپنے باپ کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر پلنگ پر لے گیا۔ پلنگ کی طرف چند قدم اٹھاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ اس کے سینے سے لگا ہوا اس کی گھڑی کی زنجیر سے کھیل رہا تھا یہ دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہیبتناک احساس پیدا ہوا۔ وہ ایک لمحہ کیلئے اسے پلنگ پر نہیں ڈال سکا کیونکہ وہ گھڑی کی زنجیر کو اتنی مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔

لیکن جیسے ہی وہ پلنگ پر لیٹ گیا ہر چیز ٹھیک معلوم ہونے لگی، جارج نے اسے کمبل سے اچھی طرح ڈھک دیا بلکہ کمبل معمول سے زیادہ اوپر کندھوں تک چڑھا دیا اس نے جارج کو ایسی نظر سے دیکھا جو غیر دوستانہ نہیں تھی۔

"اب آپ کو میرا دوست یاد آرہا ہے نا"۔ جارج نے ہمت افزائی کے طور پر سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا میں ٹھیک طور پر ڈھکا ہوا ہوں" اس کے باپ نے اس طرح پوچھا جیسے وہ خود دیکھنے کے قابل نہ تھا کہ اس کے پیر کمبل کے اندر تھے یا نہیں۔

"دیکھا آپ ابھی سے بستر کے اندر آرام محسوس کرنے لگے ہیں" جارج نے اور اچھی طرح اس کے بدن کو کمبل سے ڈھکتے ہوئے کہا۔

"کیا میں ٹھیک طور پر ڈھکا ہوا ہوں" باپ نے ایک اور بار سوال کیا، وہ اس کا جواب پانے پر غیر معمولی طور پر مصر معلوم ہو رہا ہے۔

"فکر مت کیجئے آپ پوری طرح ڈھکے ہوئے ہیں"

"نہیں" اس کے باپ نے جارج کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے چیخ کر کہا اور کمبلوں کو اتنے زور سے اٹھا پھینکا کہ وہ اچھل کر پرے جا پڑیں اور ایک لمحہ میں چھلانگ لگا کر پلنگ پر استادہ ہو گیا۔ صرف ایک ہاتھ سے سہارے کیلئے چھت کو تھامے ہوئے تھا

"تم مجھے ڈھانک دینا چاہتے تھے، میرے نوجوان چھوکرے، لیکن میں ابھی ڈھکے جانے کی منزل سے بہت دور ہوں۔ اگر یہ طاقت کا آخری سنبھالا بھی ہے تو کوئی بات نہیں کیونکہ اتنی طاقت تمہارے لئے

کافی ہے بلکہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ بے شک میں تمہارے دوست کو جانتا ہوں، وہ میرا اصلی بیٹا ہو سکتا تھا، اسی لئے تم اتنے برسوں سے اس سے جھوٹ بولتے رہے ورنہ اور کیا وجہ تھی اور اسی لئے تم اپنے آپ کو دفتر میں بند رکھتے تھے، اس بہانہ پر کہ صاحب مصروف ہیں، ان کے کام میں مداخلت نہ کی اور تم اپنے جھوٹ سے بھرے ہوئے خطوط روس کو لکھتے رہو، لیکن خدا کا شکر ہے ایک باپ کو یہ سکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنے بیٹے کو کس طرح سمجھ سکے اور اب جب تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ بوڑھا پوری طرح زیر ہو چکا ہے، اس طرح گر گیا ہے کہ تم اپنا پورا وزن ڈال کر اس پر بیٹھ سکو اور وہ ہلکی سی آواز بھی نہ نکال سکے تو اس وقت میرا ہونہار بیٹا شادی کی تیاری کر رہا ہے۔!"

جارج اس آسیبی منظر کو تک رہا تھا جو اس کے باپ کی شعبدہ بازی نے سامنے کھڑا کر دیا تھا، اس کا پیٹرزبرگ کا دوست جس سے اس کا باپ اچانک گہرا واقفکار بن گیا تھا، اس سے پہلے کبھی اس طرح اس کے تخیل میں نہیں آیا تھا، روس کی وسعت میں وہ اسے کھویا ہوا نظر آیا وہ ایک خالی اور لوٹی ہوئی دکان کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ ٹوٹا ہوا فرنیچر، لوٹ کھسوٹ سے بچا ہوا تتر بتر سامان، دیواروں کا پلستر نکلا ہوا ان سب کے درمیان وہ بمشکل کھڑا ہو رہا تھا، اسے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی !!"

"میری طرف توجہ دو" اس کا باپ چیخا اور جارج یک لخت چونک کر پلنگ کی طرف لپکا، لیکن آدھی دور بڑھ کر ٹھٹھک کر رک گیا

"چونکہ اس نے اپنا اسکرٹ اٹھا دیا" اس کے باپ نے سلسلہ شروع کیا "چونکہ اس، فاحشہ نے اپنا اسکرٹ اٹھا دیا اس لئے" اس کے باپ نے اسکرٹ اٹھانے کی نقل کرتے ہوئے اپنی قمیض چٹکیوں میں پکڑ کر اتنی اوپر اٹھائی کہ اس کی ران پر جنگ کے دوران میں آئے ہوئے زخم کا نشان صاف دکھائی دینے لگا

چونکہ اس نے اس طرح اور اس طرح اسکرٹ اٹھایا اس لئے تم اس پر مرمٹے اور اس کے ساتھ بغیر کسی مداخلت کے آزادانہ ملنے کے لئے تم نے اپنی ماں کی یاد کو دھبہ لگایا اور اپنے دوست سے بیوفائی کی اور اپنے باپ کو پلنگ پر ٹھونس دیا تاکہ وہ چل پھر نہ سکے، لیکن وہ چل پھر سکتا ہے ہے نا؟"

اور وہ بغیر کسی سہارے کے کھڑا ہو گیا اور زور زور سے ہوا میں اپنی ٹانگیں چلانے لگا، اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

جارج اپنے باپ سے، زیادہ سے زیادہ دور ہٹ کر ایک کونے میں سہم کر کھڑا ہو گیا، بہت دیر پہلے اس نے سوچ لیا تھا کہ پتہ نہیں کس طرف سے یلغار ہو اس لئے ہر معمولی حرکت پر چوکنا رہنا چاہئے، اس لمحہ اس نے پھر بہت دیر پہلے کئے ہوئے اور بھولے ہوئے اس فیصلہ کو یاد کیا اور پھر اسی لمحہ بھول گیا جیسے کوئی آدمی

کوئی آدمی دھاگے کا ایک ننھا سا ٹکڑا سوئی کے ناکے میں پرونے کی کوشش کرے اور ہر مرتبہ دھاگا ادھر سے ناکہ میں داخل ہو اور اُدھر سے نکل جائے

"لیکن تمھاری اپنے دوست سے دغا بازی کامیاب نہیں ہو سکتی" اس کا باپ چیخا میں یہاں اس جگہ اس کی نمائندگی کر رہا ہوں"۔

"کیا مزاحیہ ناٹک ہے" جارج کی زبان سے الفاظ گویا پھسل پڑے، فوراً اس نے اپنی غلطی کا احساس کر لیا، اس کا سر جھکا گیا اور اس نے اپنی زبان کاٹ لی لیکن الفاظ زبان سے نکل چکے تھے۔

"ہاں بے شک میں ایک مزاحیہ ناٹک ہی کھیل رہا ہوں! مزاحیہ ناٹک۔ بہت موزوں نام ہے، ایک بوڑھے رنڈوے کے لئے اس کے علاوہ اور کونسا آرام رہ گیا تھا، ہاں مجھے بتاؤ اور اب بھی میرے زندہ بیٹے کی طرح بتاؤ کہ میرے لئے تم نے باقی ہی کیا چھوڑا تھا، ان بوڑھی ہڈیوں کو نافرمان بردار اور گستاخ ملازمین کے ہاتھوں اس پیچھے کے کمرے میں پریشان ہونے کے لئے چھوڑ کر میرا بیٹا دنیا بھر میں اینٹھتا ہوا پھر تا رہا جو کاروباری معاملات میں نے اس کے لئے طے کئے تھے انھیں مکمل کرتا ہوا کامرانی کے نشہ میں پھولا نہ سماتا، ایک معزز کاروباری آدمی کی شکل بنائے ہوئے اپنے باپ کے ساتھ ہی ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا رہا۔ تم سمجھتے ہو مجھے تم سے محبت نہیں تھی؟ تم، جسے میں نے جنم دیا؟"

اب یہ آگے جھکے گا، جارج نے سوچا یہ لڑکھڑا کر گرے اور ختم ہو جائے تو کیا ہوگا؟ جارج کے ذہن میں یہ الفاظ چکر کاٹ رہے تھے۔

اس کا باپ جھکا تو سہی لیکن لڑکھڑا کر گرا نہیں۔ لیکن چونکہ خلاف توقع جارج قریب نہیں آیا وہ دوبارہ سیدھا ہو گیا۔

"تم جہاں ہو وہیں رہو مجھے تمھاری ضرورت نہیں ہے، تم سمجھتے ہو تم میں یہاں تک آنے کی طاقت ہے اور تم صرف اپنی مرضی سے رکے ہوئے ہو، بہت زیادہ برخود غلط نہ بنو، میں اب بھی ہم دونوں میں زیادہ طاقتور ہوں اگر مجھے صرف اپنے پر ہی تکیہ کرنا ہوتا تو میں کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا لیکن تمھاری ماں نے اس کی طاقت مجھے اتنی زیادہ دی ہے کہ میں نے تمھارے دوست سے رابطہ قائم رکھا ہے اور تمھارے سارے گاہک یہاں میری جیب میں رکھے ہوئے ہیں!"

"دوان کی قمیض میں بھی جیبیں ہوتی ہیں،" جارج نے دل میں کہا اور مطمئن ہو گیا کہ اس ایک جملہ سے وہ ساری دنیا کے سامنے اپنے باپ کا مضحکہ خیز کردار پیش کر سکتا ہے۔ صرف ایک لمحہ کیلئے اس کے ذہن میں

یہ خیال آیا کیونکہ وہ ہر چیز مستقل بھولتا جارہا تھا

"تم اپنی دلہن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نکلو اور سیدھا میرے راستے میں آنے کی کوشش کرنا پھر میں بتاؤں گا میں کیا کرسکتا ہوں میں اسے تمھارے پہلو سے نکال پھینکوں گا۔ کیسے یہ تمھیں ابھی پتہ نہیں چلے گا"

جارج نے بے یقینی کے انداز میں منہ بنایا۔ اس کے باپ نے سر ہلایا۔

"کیا مزہ آیا ہے آج، تم مجھ سے اپنے دوست کو اپنی منگنی کی اطلاع دینے کی اجازت لینے آئے ہو۔ ارے اسے تو سب خبر ہے، احمق لڑکے اسے تو ہر بات کی خبر ہے، میں اسے سب لکھتا رہا ہوں، کیونکہ تمھیں میرے لکھنے پڑھنے کا سامان مجھ سے چھیننا یاد نہیں رہا تھا، اسی لئے تو وہ یہاں برسوں سے آیا نہیں ہے، یہاں کی ہر بات وہ تم سے سو مرتبہ زیادہ بہتر جانتا ہے۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے تمھارے خطوط بغیر کھولے مروڑ کر پھینک دیتا ہے اور داہنے ہاتھ میں میرے خطوط پڑھنے کے لئے اٹھاتا ہے"

جوش میں اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر لہرایا۔ "وہ ہر چیز تمھارے سے ہزار گنا زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے" وہ چیخا "دس ہزار مرتبہ زیادہ ہی" جارج نے اپنے باپ کا مذاق اڑانے کے لئے کہا، لیکن یہ بات اس کی زبان سے یوں نکلی جیسے سو فیصد سچ ہو۔

"میں برسوں سے منتظر تھا کہ تم اس کی کوئی بات لے کر میرے پاس آؤ! تم سمجھتے ہو میں نے اس کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی لی ہے؟ تم سمجھتے ہو میں اخبار پڑھتا ہوں؟ دیکھو!"۔ اور اس نے جارج کی طرف اخبار کا ایک ورق پھینکا جو وہ کسی طرح پلنگ پر اپنے ساتھ لے گیا تھا، کوئی بہت پرانا اخبار تھا جس کے نام سے بھی جارج مطلقاً آشنا نہ تھا۔

"تم نے پیٹ کے پاؤں نکالنے میں کتنا وقت لیا ہے! تمھاری ماں کو مرنا تھا، وہ یہ خوشی کا دن نہ دیکھ سکی، تمھارا دوست روس میں موت کے منہ میں جارہا ہے، تین سال پہلے ہی وہ اتنا پیلا پڑ گیا تھا کہ اسے مٹی میں سونپ دیا جاتا اور میں ـــ میری جو حالت ہے وہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو یہ دیکھنے کے لئے تو تمھارے چہرے پر آنکھیں ہیں"

"تو تم میری گھات میں لگے رہے ہو" جارج چیخ اٹھا۔

اس کے باپ نے بے پروائی سے رحم آمیز لہجے میں کہا "میرا خیال ہے تم یہ بات بہت پہلے کہنا چاہتے تھے لیکن اب کوئی فرق نہیں پڑتا"

پھر بلند آواز میں اس نے کہا "تو اب تمھیں پتہ چلا کہ دنیا میں تمھارے علاوہ اور کیا کچھ ہے۔ اب تک تمھیں صرف اپنی ذات کے بارے میں معلوم تھا۔ بالکل ایک معصوم بچے کی طرح۔ ہاں تم معصوم بچے ہی تھے بلکہ اس

سے کہیں زیادہ تم شیطان کا انسانی پیکر تھے ۔ لہٰذا غور سے سنو، میں تمھاری موت کا فیصلہ صادر کرتا ہوں تم دریا میں ڈوب کر جان دو گے"۔

جارج نے محسوس کیا کوئی طاقت اسے کمرے سے باہر لے جارہی تھی، بھاگتے ہوئے اس کے کانوں میں باپ کے پلنگ پر گرنے کا دھماکہ گونج رہا تھا، زینوں پر سے وہ ڈھلوان میں دوڑتے ہوئے آدمی کی طرح اترتے ہوئے وہ گھر کی خادمہ سے جو ٹکرا گیا جو کمرے میں صبح کی صفائی کرنے کیلئے جارہی تھی، اس نے چیخ مار کر پیش بند سے اپنا منہ ڈھانپ لیا لیکن وہ جاچکا تھا اور سامنے کے دروازے سے نکل کر پانی کی طرف جانے والے راستے پر پہنچ چکا تھا پل پر پہنچ کر کٹھرے کی سلاخوں کو اس نے اس طرح پکڑ لیا تھا جس طرح کوئی بھوکا آدمی روٹی کے ٹکڑے کو دبوچ لے۔ وہ اچھل کر کٹھرے کی دوسری طرف آگیا بالکل ایک مشاق کرتب باز کی طرح۔ نوجوانی میں اس کی کرتب بازی واقعی اس کے والدین کے لئے فخر و مسرت کا باعث تھی۔ کمزور ہوتی ہوئی گرفت کے ساتھ وہ ابھی کٹھرے کی سلاخوں کو پکڑے ہوئے لٹکے ہوا تھا، سلاخوں کے درمیان سے اس نے نظر دوڑا کر دیکھا ایک بس آرہی تھی جس کے شور میں پانی میں کودنے کی آواز گم ہو جاسکتی تھی، مدھم آواز میں اس نے پکارا "پیارے والدین میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی ہے، سب کچھ ہونے کے بعد بھی" اور اس نے آپ کو پانی میں گرا دیا۔

اس لمحہ برج پر ٹریفک کا لاتناہی سلسلہ گزر رہا تھا۔ (تلخیص و ترجمہ: محمود ایاز)

بازگشت

سوغات کا شکریہ، پڑھا ع ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے۔ اصل میں آپ کے کئی پرچے کوئی نہ کوئی دوست طعنے کے طور پر مجھے دے دے گیا کہ تم نے پاکستان میں نئی نسل کی بات کھڑی کر کے کیا خاک اڑائی اور دیکھو ہندستان میں نئی نسل کیا کر رہی ہے، میں یوں بھی خوش ہوا۔ کہیں تو ایسے لوگ ہیں جنھیں میں کوئی مسئلہ پریشان بھی کرتا ہے اور کوئی تو ایسا رسالہ ہوا جو اپنے زمانہ سے غرض رکھتا ہے۔ ویسے آپ کے تازہ پرچے کو دیکھ کر مجھے ڈر سا تھا کہ کہیں آپ بھی میر پر مضمون چھاپنے شروع نہ کر دیں

وحید اختر صاحب نے نئے لکھنے والوں کو اہل بیت ادب شاید درست ہی کہا ہے۔ یہاں نئے لکھنے والے سچ مچ اہل بیت بنکر رہ گئے ہیں۔ ویسے آپ کے تازہ پرچے میں ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے بھی حکیم کی روایت کو خوب نبھایا اور اس دور کی خلافت کا فیصلہ کیا خوب کیا۔ خیر مجھ خارجی کو کیا، مسند خلافت پر کوئی بیٹھے۔ ہمارے بزرگوں میں کچھ اپنے زمانے میں امام بن گئے تھے، کچھ پسماندگاں اس زمانے میں آکر امام وقت ٹھہرے ع

جو داں نہ کھینچ سکے وہ یہاں آ کے دم ہوئے۔

خلافت و امامت کے مسئلے سے قطع نظر میں ڈاکٹر محمد حسن کے مضامین بڑے شوق سے پڑھ رہا ہوں۔ مگر میں ان سے اتنی دور ہوں کہ میرا غصہ اور میری داد کچھ بھی تو ان تک نہیں پہنچا۔ ایک دفعہ میں نے خط لکھ کر ان سے پوچھا تھا کہ علی گڑھ کے ایکے کس حال میں ہیں۔ اس کے بعد ان کے تنقیدی مضامین تو بہت پڑھنے کو ملے مگر ایکے سے گرے ہوئے مسافر کو اپنے سوال کا جواب نہ ملا۔ انھیں آپ خط لکھیں تو میرا سلام کہیں

انتظار حسین

سوغات کا تازہ پرچہ اچھا نکلا ہے۔ سرورق تم نے اور بھی اچھا بنوایا ہے اور اسے دیکھ کر پاکستان کے رسالوں کے مقابلے میں کسی طرح کا احساس کمتری نہیں ہوتا۔ جہاں تک مواد کا تعلق ہے یہ ضخیم ترین ادب عالیہ نمبروں سے ہزار درجہ بہتر ہے، اس لئے کہ سوغات کا ایک کردار بن چکا ہے، سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ سوغات ہی ایک ایسا پرچہ ہے جسے ادب کے زندہ مسائل سے دلچسپی ہے اور جو مردہ یا زندہ ادیبوں کی مردم شماری یا کھتونی

طرح یہ اہم ترین سوال پوچھا، "اس دنیا میں حقیقی چیز کونسی ہے؟"

کافکا قصہ گوئی کے فن میں ماہر تھا، قدیم اندازِ بیان کا اس نے بہت مناسب اور معنی خیز طور پر طنزیہ استعمال کیا۔ اس نے معلوم اور نامعلوم کو انتہائی داخلیت اور ٹھوس خارجی اشیا کو اس مرئی دنیا اور ایک خوابناک اور جادوئی فضا کو اس طرح ایک دوسرے میں سمو دیا کہ یہ سب چیزیں ایک ساتھ سمٹ آئیں، اپنے متضاد عناصر کو ایک وحدت کی شکل دیتے ہوئے اس نے نثری افسانے کے فن میں ایک نوعی انقلاب پیدا کر دیا۔

اب یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اگر کافکا کی تحریرات کی نیم حقیقی فضا میں ہم اپنے دور سے شدید طور پر قریب ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کے کرداروں سے ہم آہنگ پاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کافکا کے ہاں انسان کی تنہائی، احساسِ گناہ اور احساسِ زیاں کے اس تجربے کا بہت شدید اور گہرا احساس ملتا ہے جو جدید دور میں روز بروز واضح اور عام ہو جاتا ہے

یہ طے شدہ بات ہے کہ ادیبوں میں کافکا زبردست ترین اعصابی مریض تھا اور اسکی عجیب و غریب تخیلوں اور ادبی تخیل کے مسلمہ معیار اور اصولوں سے اس کے انحراف میں اس اعصاب زدگی کا بھی دخل تھا لیکن یہ بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اگر اس بات کو ملحوظ نہ رکھا جائے کہ کافکا ایک اعصاب زدہ فنکار کے علاوہ کچھ اور بھی تھا، وہ اعصاب زدگی کا فنکار بھی تھا کیونکہ اس نے تخیل کے ذریعے سے ان ذہنی کیفیات کی عکاسی کی جو ایک اعصاب زدہ ذہن سے مخصوص ہوتی ہیں اور اس طرح اس نے اپنی نجی دنیا کو ہماری آپ کی اس دنیا کا ایک حصہ بنا دیا۔ اس مقصد کے حصول کے ساتھ ایک تخلیقی ادیب اپنے اس اہم کام سے فارغ ہو جاتا ہے جس میں بحیثیت انسان نہ سہی لیکن بحیثیت فنکار اس کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس عمل میں وہ اپنے پیرِ تسمہ پا سے رہائی اور اپنے ذاتی بوجھ سے آزادی حاصل کرتے ہوئے ہمیں اس مہم میں اپنا شریک اور معاون بنا لیتا ہے اور ہمیں بھی اچھے قارئین اور رضامند معاونین کی طرح اس سے شکایت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اعصاب زدگی موضوع یا وجہ سہی لیکن اسکے نتائج ادب کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، علاوہ ازیں اگر نارمل اور غیر نارمل شخصیت کے فرق کی پہچان اگر مقصود بھی ہو تو اس کے لئے ایک فنکار کی شخصیت کا انتخاب نہایت غیر موزوں ہوگا، ناول نگار گراہم گرین نے ایک بار کہا تھا "ہر قابلِ توجہ تخلیقی ادب دہ تخلیق والا جسے وسیع مفہوم میں شاعر کہا جا سکے ایک مریض ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی ذہنی خبط میں گرفتار ہوتا ہے۔"

بے بضاعتی، ناتمامی، ناکامی اور گناہ کا ایک حد سے تجاوز کردہ غیر فطری اور شدید احساس کافکا کا ذہنی خبط تھا، ایک ایسا احساسِ گناہ جس کا اس کے کسی کردہ یا ناکردہ عمل سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ جو اس کے وجود کی گہرائیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ایک نوٹ بک میں لکھا تھا، "ہم جس حالت میں اپنے آپ کو پاتے میں

وہ کسی جرم کا نتیجہ نہ ہوتے ہوئے بھی گناہ سے آلودہ ہے" اس کے ناول THE TRIAL میں یہ ایک جملہ ہے جو
اس ناول کے سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے "صرف وقت کا ہمارا تصور روزِ جزا کو ہمارے لئے اس نام سے موسوم
کرتا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے یہ عدالت مستقل لگی ہوتی ہے اور لمحہ بہ لمحہ اپنے فیصلے دیتی جارہی ہے"۔ اسی سلسلے میں
آگے چل کر کافکا نے یہ خاص جملہ بھی لکھا ہے۔ شکاری کتے صحن میں کھیل رہے ہیں، لیکن خرگوش ان سے بچ نہیں
سکتا خواہ وہ اسی لمحہ جنگل میں غائب ہوکر کتنی ہی تیزی سے کیوں نہ دوڑ رہا ہو" یہاں خرگوش میں اس کی اپنی ذات
کی جھلک تو واضح ہے ہی، لیکن شکاری کتوں میں بھی مصنف کے وجود کی جھلک شامل ہے، کیونکہ یہ کتے خرگوش کی
سزا اور اذیت حاصل کرنے کی اس اندرونی خواہش کی نمائندگی کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ چاروں طرف سے محصور ہو جانا
چاہتا ہے اور اپنے ہاتھوں اپنی موت کو دعوت دیتا ہے تاکہ اس طرح اس گناہ کا کفارہ ادا کر سکے جس کا احساس اس کے
وجود میں جاری وساری ہے۔ خرگوش اور شکاری کتوں کے بارے میں اس ایک چھوٹے سے جملے میں کافکا کے مخصوص
فن اور موضوع کی ساری تفصیل آجاتی ہے، اس کی ہر کہانی کا موضوع ایک دسترس سے بعید قادرِ مطلق قوت
کے ہاتھوں میں پھنسے ہوئے مجبور ومظلوم کی داستان ہوتا ہے۔ ہر بار وہ اسی طرف لوٹ کر آتا ہے لیکن ہر بار حیرت
انگیز طور پر مختلف اور پیچیدہ طریقوں سے اس بنیادی خیال کی تعمیر کرتا ہے اس معمولی سے ڈھانچے پر اس نے ایسی
عالی شان عمارتیں کھڑی کردی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے IN THE PENAL COLONY کا لورِ رعا کا ندر
THE TRIAL میں قانون اور THE CASTLE میں ایک نوکر شاہی کی اسطور ان سب کی تعمیر ایک
ہی بنیاد پر ہوئی ہے۔

لیکن یہ بات غلط ہوگی اگر کافکا کی کہانیوں کے مرکزی خیال کی سادگی کے پیش نظر اس کے ان خصائص کو نظر انداز
کر دیا جائے، جن کی وجہ سے وہ عالمی ادب میں مشکل ترین معمہ بنا ہوا ہے جو ڈانٹے اور بنین۔ جیسے مذہبی تمثیل
نگاروں کی طرح وہ کسی ایک معروف مذہبی نظام کی قطعی منطقیت پر انحصار نہیں کرتا اس کا تخلیقی جذبہ اپنی ذات
سے باہر کسی خارجی دائرۂ علم کے وجود کو لازمی نہیں قرار دیتا۔ اسے مروجہ معنوں میں تمثیل نگار نہیں کہا جا سکتا لیکن
اس کی ادبی اختراعات اتنی شدید طور پر ذاتی ہو گئی ہیں کہ انہیں بنے بنائے خانوں میں بٹھایا نہیں جا سکتا
کافکا کو سمجھنے میں جو مشکلات ہیں وہ اور ہی سطح پر پیش آتی ہیں، اور جوائس وغیرہ کو سمجھنے کی مشکلات سے الگ
اور مختلف ہیں۔ جوائس کی مشکلات زیادہ تر اس کے اسلوب اور بیان وتعمیر کی پیدا کردہ ہیں، لیکن کافکا کے ہاں
صرف مفہوم کی تلاش ہمیں پریشان کرتی ہے۔ کافکا کے ہاں زبان اور کہانی کی تعمیر جوائس کے مقابلے میں بڑی
مبتدیانہ ہے، پھر بھی اس کی کہانیاں گئی پڑھنے والوں کے حواس اڑا دیتی ہیں۔ لیکن کافکا افسانہ گوئی کے چند

مسلمات سے اپنی تمثیل نگاری کی خاطر جس آزادی سے جہاں جی چاہے انحراف کرتا ہے اس سے اگر ہم مانوس ہوتے جائیں اور اس کے لب لہجے کو بغور سننے لگیں تو پھر اس کے افسانوں کی یہ بدحواس کر دینے والی پراسرار کیفیات بتدریج واضح ہونے لگ جاتی ہیں۔

اسی طرح جب ہم THE META MORPHOSIS کے پہلے جملے میں یہ پڑھتے ہیں کہ گرگ گریگر سمسا ایک صبح نیند سے بیدار ہو کر اپنے آپ کو ایک نہایت بڑے کیڑے میں تبدیل پاتا ہے تو یہ سمجھنا غلط ہے کہ ایسی غیر ممکن بات لکھ کر کافکا فطرت کے اصولوں کو معرض بحث میں لا رہا ہے بلکہ وہ تو افسانے میں فطرت کے قوانین کا ہمیشہ لحاظ رکھنے کی روایت کو جھٹلا رہا ہے اور پہلے ہی جملے میں اس روایت کو معطل کر دینے کے بعد جس نکتہ سے افسانے کا آغاز ہوتا ہے وہاں سے اس کا ارتقا بالکل حقیقی اور منطقی انداز میں ہوتا ہے، کلرک کی قلب ماہیت کی تمثیل اپنے اندر کئی معنی رکھتی ہے: سمسا کا انسانی زندگی سے اپنے آپ الگ اور اجنبی محسوس کرنا، اس میں اپنی بے روح اور بوجھل زندگی کے شعور کا "بیدار ہونا" اپنے لاشعور کی اس غیر حقیقی اور خیالی زندگی میں اس کی بے حد مایوس کن خود بیزاری جس میں باپ کو خاندان کے بڑے کی حیثیت سے ہٹا کر خود اس کی جگہ لینے کی خواہش کو (ایسی خواہش کرنے کے) جرم کے احساس کی سزا طلبی کی شدت میں ناکام بنا دیتا ہے۔

کافکا کی کہانیوں میں اسی طرح مختلف تمثیلیں اور علامتیں آتی ہیں INVESTIGATIONS OF A DOG میں خدا کی دوری کو بعد مکانی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، پیکن جنوب میں بسنے والے دیہاتیوں سے اتنی دور ہے کہ وہ اس کے وجود کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ وہ ان بادشاہوں کی پرستش کر رہے ہیں جو کب کے مر کھپ چکے تھے۔ شاہی دربار سے کوئی خبر ان تک پہنچتے پہنچتے وقت کے ہاتھوں قدیم اور بیکار ہو جاتی ہے۔ ان چینیوں کی اپنے بادشاہ کو ایک زندہ اور موجود شکل میں پانے میں ناکامی جدید انسان کے تصور خدا کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کے لئے خدا ایک مبہم دھندلے اور سب سے بڑھ کر ایک فرسودہ اور متروک خیال کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان ان اعلیٰ طاقتوں سے بے خبر ہے جو اس کی زندگی پر اختیار رکھتی ہیں، خدا یا مشیت کے بارے میں اس کا جو کچھ علم ہے اس کی نوعیت خالصتاً تاریخی ہے۔

کافکا کے نفسیاتی اور مذہبی شارحین کے درمیان جو جھگڑا ہے وہ زیادہ اہم نہیں ہے کیونکہ کافکا کی تحریرات میں کافی چیزیں ایسی ہیں جو دونوں طبقوں کی چند ایک "صداقتوں" کی تائید کرتی ہیں۔ "فیصلہ" میں اپنے بیٹے کی موت کا حکم صادر کرنے والا باپ فرائڈین اسکول کے ظالم و جابر باپ کی بھی نمائندگی کرتا ہے اور مذہبی نقطۂ نظر سے وہ روز حساب کے اس جبار و قہار خدا کی علامت بھی بن جاتا ہے جو ذہن پر انسان کی اپنے آپ کو خود کشفی سمجھنے کی کوشش

فہمی کو ملیامیٹ کرنے کے لئے غیظ و غضب میں آجاتا ہے، بنیادی طور پر ان دونوں تشریحات میں کوئی تضاد نہیں ہے. کیونکہ ایک تو کہانی میں دونوں کی گنجائش ہے اور دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ کہانی کی معنویت کا تعین کرنے میں پڑھنے والے کے نقطۂ نظر کا بھی اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا کہانی لکھنے والے کے نقطۂ نظر کا. کافکا کے کردار میں ایک ایسا عجز اور انکسار تھا جو اسے زندگی کے بارے میں کسی ایک رویہ یا نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا. اس نے چند ایک جملوں میں جو اس نے صیغۂ غائب میں لکھے اپنے متعلق واضح طور پر کہا ہے:

"وہ سوائے اپنے آپ کے اور کوئی چیز ثابت نہیں کرتا اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ خود ہے اس کے سارے حریف اسے جھٹلا کر نہیں (کیونکہ جھٹلانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا) بلکہ اپنے آپ کو ثابت کر کے اس پر فوراً غالب آجاتے ہیں"

مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ کافکا مذہبی طبیعت کا آدمی تھا، اس میں شبہ نہیں اس نے ان فی. مایوسی اور ناکامی کی لاثانی تصویریں پیش کیں وہ ہمیشہ یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ مالیخولیا، نامردی، بیماری اور ایک قیدی کے ہذیانی خیالات نے اسے اس زمین پر جکڑ رکھا تھا لیکن اس کے باوجود وہ وجود کی روحانیت پر اعتقاد کو ہاتھوں سے جانے نہیں دیتا تھا اور اپنی ادبی کاوشوں سے دل شکستہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی تحریروں میں ایسی طاقت ہو کہ پڑھنے والوں کو سچائی اور اصلیت کی ایک ناقابل تغیر دنیا میں پہنچا دیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمیں کافکا کے افسانوں میں یا اس کے ذاتی کاغذات میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے اس بات کی تصدیق ہو سکے کہ وہ ایک ذاتی خدا کو مانتا تھا. "ابتدائی گناہ" کا عقیدہ جو اس کی تحریرات میں مرکزی خیال سے اتنا زیادہ قریب ہے اس کے بارے میں بھی وہ قیاس آرائی کرتے ہوئے کہتا ہے "اس کی بنیاد انسان کی ہمیشہ کی اور کبھی نہ ختم ہونے والی اس شکایت پر قائم ہے کہ اس کے ساتھ ایک بے انصافی کی گئی تھی اور اس پر "ابتدائی گناہ" کا ارتکاب کیا گیا تھا" ظاہر ہے مذہبی علماء کے نزدیک یہ ناقابل برداشت بدعت ہے، جرمن نقاد فرانز بلے جو کافکا سے ذاتی طور پر واقف تھا اس کے متعلق کہتا ہے کہ "وہ اس خدا کا غلام تھا جس پر اسے یقین نہیں تھا"

کافکا ۱۸۸۳ء میں پراگ میں ایک متوسط طبقہ کے یہودی خاندان میں پیدا ہوا، زندگی کے ابتدائی ایام میں ہی کافکا خود اعتمادی سے محروم ہو گیا اور اس کے اپنے الفاظ میں اس کے بدلے اس نے ایک لامحدود احساس گناہ کا بوجھ اٹھا لیا. ناکامی اور مایوسی کی کیفیات اور بے حد معمولی انسانی مسائل کے بھی ناقابل حل ہونے کے احساس نے اس کی جوانی کو کچل دیا لیکن آگے چل کر اس کے آرٹ کو فیضان بخشا، اپنی ذات سے اس کی بے اعتمادی اس درجہ کو پہنچی ہوئی تھی کہ عزم اور ارادے کا ہر معمولی مظاہرہ اس کے لئے بے حد حیرت

اور تعریف کا موجب ہوتا تھا

لوگوں کا اپنے اپنے اصلی کاموں کو پہچان کر زندگی گزارنا اور معاشرے سے ہم آہنگ ہو کر جینا کافکا کو بہت بڑا کارنامہ معلوم ہوتا تھا۔ فرد کی معاشرے سے ہم آہنگی کو اس نے بے حد اہمیت دے رکھی تھی لیکن زندگی بھر وہ اس ہم آہنگی کو اپنی دسترس سے دور سمجھتا رہا۔ ہاتھورن کی کہانی THE INTELLIGENT OFFICER کے ایک کردار کی طرح کافکا بھی عمر بھر یہ ماتم کرتا رہا "مجھے میری جگہ چاہئیے میری اپنی جگہ، میرا اصلی دائرۂ کار جہاں میں میرا اپنا کام کر سکوں وہ کام جس کی تکمیل کے لئے قدرت نے مجھے اس طرح پیدا کیا ہے اور جس کی میں عمر بھر ناکام تلاش کرتا رہا"

کافکا کی زندگی کا مرکزی نقطہ باپ ہے، فرائڈ کے ہیبت ناک قدیم آمر مطلق سے ملتا جلتا کردار۔ چست و توانا متکبر، وہمی، کامیاب اور معزز باپ جو اپنے بیٹے کے غیر عملی رجحانات اور روحانی سیاحتوں کو کسی کینہ توزی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی طبیعت کی وجہ سے تنفیص کے تحقیر سے دیکھنے پر مجبور تھا، ماں اپنے بیٹے کے لئے فکر مند ضرور تھی، لیکن وہ اتنا زیادہ شوہر کے زیر اثر تھی کہ آزادانہ طور پر کچھ نہیں کر سکتی تھی اور اس طرح نوعمر کافکا تنہائی اور خود گزینی کی اس انتہا کو پہنچ گیا جہاں ایک باعزت پیشہ اختیار کرنا اور شادی بچوں کے ذریعہ معاشرے سے ہم آہنگ ہونے کا ہر امکان ختم ہو گیا۔ اس پر اپنے باپ کے اثر کا یہ عالم تھا کہ یوں عام طور پر کافی اچھی گفتگو کرنے والا کافکا باپ کے سامنے ہکلانے لگ جاتا تھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں اس نے اپنے باپ کو لکھا "میرے لئے آپ میں وہ پراسرار چیز پیدا ہو گئی ہے جو تمام جابروں میں ہوتی ہے اور جو دلائل کے زور پر نہیں بلکہ صرف اپنی شخصیت کے بل پر تھا ہر استحقاق منواتے ہیں"

"حاکمیت" کا نظریہ کافکا کی تحریروں کا مرکزی نقطہ ہے اور ابتدا میں METAMORPHOSIS اور JUDGEMENT میں "اصلی" باپ اس حاکمیت کی نمائندگی کرتا ہے جسے فرائڈ کی اصطلاحات میں پہچاننا زیادہ مشکل نہیں ہے، لیکن بعد کی طویل تحریروں میں باپ کو اس دنیا کے کسی فرد کی حیثیت سے نہیں پہچانا جا سکتا اسے خاندان کے دائرہ سے نکال کر ایک پراسرار بعید اور با اقتدار آہنی قوت میں تبدیل کر دیا گیا ہے، جیسے قانون، عدالت اور قلعے کے اندر رہنے والے افسروں کے نظام۔

کافکا نے اپنے خطوط میں لکھا ہے کہ اس کے لئے زندگی میں مسرت اور تکمیل کی واحد امید ادب ہی تھی اس پر جو وجد کی کیفیتیں طاری ہوتی تھیں ان کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ ایسے لمحوں میں وہ اپنے آپ کو انسانیت کی آخری سرحدوں پر محسوس کرتا تھا، لیکن ان لمحوں میں فیضان کی صلاحیت نہ تھی اور وہ اچھے ادب کی تخلیق کیلئے سازگار نہ

ہوتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک "نئے خفیہ نظریے" کی تخلیق کرنے والا تھا، لیکن جب اس نظریے کی وضاحت طلب کی گئی تو اس نے جو جوابات دیئے وہ ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد تھے۔ میکس براڈ نے جو کافکا کا عمر بھر کا ساتھی تھا اس کے بارے میں بالکل ٹھیک کہا تھا کہ کافکا کے مسائل کی نوعیت فکری نہیں بلکہ اخلاقی ہوتی تھی۔

کافکا نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے "میں اپنے دور کے منفی عناصر کی نمائندگی کرتا ہوں کیرکے گارڈ کی طرح مجھے زندگی میں عیسائیت کی رہنمائی نہیں ملی جواب غرق دریا ہو رہی ہے۔ اور نہ میں نے صیہونیوں کی طرح یہودیوں کی ڈوبتی ہوئی عبا کا دامن تھاما ہے" براڈ سے اس کے تعلقات میں ایک ناچاقی صیہونیت سے عدم دلچسپی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اس نے لکھا "بھلا مجھ میں اور یہودیوں میں کیا چیز مشترک ہو سکتی ہے، جبکہ میرے اور میری ذات کے درمیان ہی کوئی چیز مشترک نہیں ہے" لیکن بعد اس نے صیہونیوں کے مقاصد سے کافی دلچسپی پیدا کرلی، عبرانی سیکھی، یہودیوں کی لوک کہانیوں اور تالمود کا مطالعہ کیا۔

THE JUDGEMENT پہلی کافکائی کہانی ہے جو پوری طرح مکمل ہے اور جس میں پہلی دفعہ باپ اور بیٹے کے درمیان کشمکش کی مخصوص تھیم کافی پوری گہرائی کے ساتھ اظہار ہوا ہے۔ کافکا نے اپنے دوست اوسکر پولاک کے نام خط میں لکھا تھا "ہمیں ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو ہم پر ایک المناک سانحے کے ٹوٹ پڑنے کا تاثر پیدا کریں اسے درد اور کرب میں مبتلا کریں جو ہمیں اپنی ذات سے زیادہ عزیز اور محبوب ہستی کی موت پر محسوس ہو سکتا ہو ہمیں ایسا محسوس کرائیں جیسے ہم خود کشی کے نقطہ پر پہنچ گئے ہوں یا کسی ایسے جنگل میں گم ہو گئے ہوں جہاں سے دور دور تک انسانی آبادی کا نام و نشان نہ ہو۔ ہم اپنے اندر جو منجمد دریا چھپائے ہوئے ہیں اسے توڑنے کے لئے ایک کتاب کو کلہاڑی کا کام کرنا چاہیئے۔"

کافکا نے THE JUDGEMENT اور METAMORPHOSIS کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں اور اپنی ڈائری میں جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کہانیوں نے اس کے اندر منجمد دریا کے لئے کلہاڑی کا کام کیا تھا، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ان کہانیوں کے لکھتے وقت تخلیقی عمل پر بندھ کو توڑتا ہوا وجود کے بعید از دسترس گوشوں تک پہنچ کر مدفون خیالات تک کو باہر لے آیا۔ ان افسانوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کافکا کے اندر کا اعصابی مریض اور فنکار دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ یقیناً ایسی ہی تخلیقات کے بارے میں ایٹس کے یہ الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ "تخلیق جتنی زیادہ غیر شعوری ہو اتنی ہی زیادہ موثر اور طاقتور ہوگی۔"

(ترجمہ: محمود ایاز)

سوغات

کے آئندہ شمارے کی ایک جھلک

● جدید اردو نظم کے پس منظر، ارتقا اور حال پر مضامین ● بعد از جنگ کے دور کی جدید انگریزی نظم کا تعارف ● جدید اردو نظم میں انگریزی اور فرانسیسی نظم کی روایات کا جائزہ

●

دس جدید نظم گوؤں کی تیس تازہ نظمیں اور ہر شاعر کی نظموں پر مختلف صاحب فکر نقادوں کے قلم سے الگ الگ تبصرے۔ یہ تبصرے شاعر کے نام کو نقاد سے مخفی رکھ کر کرائے جائیں گے

اس شمارے کے لئے نظمیں (کم از کم تین اور غیر مطبوعہ) جنوری کے اواخر تک اور جدید نظم کے بارے میں سنجیدہ اور خیال افروز مضامین (طبعزاد اور ترجمے) فروری کے وسط تک مل جانے چاہئیں

ماہی سوغات ۲۷ کلائن روڈ بنگلور ۵

بازگشت کا بقیہ

پتہ نہیں یہ امید کا سمبل ہے یا شاعر کا محبوب جو اپنی میٹھی باتوں سے اس دور میں بھی ڈھارس بندھاتا ہے، یا خود شاعر کا وجود ہے جو اس اجڑی دھرتی پر بھی نغمے الاپ رہا ہے، ان باتوں سے قطع نظر نظم کامیاب تجربہ ہے۔ سحر زدہ شہر کا دار ومدار پوری طرح پرانی داستانوں کے کچھ حصے دہرانے پر ہے، اچھے ساقی فاروقی نے بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے، یہ تمثیلی انداز مجھے بڑا حسین لگتا ہے، اختر الایمان نے ایک نظم میں دشت ہویدا کا دیوانہ کہہ کتنی وسعتیں ایک مصرع میں سمیٹ لی ہیں

سحر زدہ شہر میں داستان کی پوری تفصیلات اور فروعات سے جو استفادہ کیا گیا ہے، شاعر اس کے لئے قابل مبارکباد ہے، بہر حال آپ نے جن نظموں پر توجہ دلائی ہے وہ یقیناً اس کی مستحق تھیں اور اپنے دور کی کامیاب نمائندگی کرتی ہیں

قاضی سلیم

سوغات ملا، مل گیا، ممنون ہوں، میں نے بہت سی چیزیں پڑھ ڈالی ہیں۔ آپ کا پرچہ ہندستان میں چھپنے والے تمام پرچوں سے بہتر ہے اور مجھے اس بات کا رنج ہو رہا ہے کہ آپ نے مجھے تین شماروں سے کیوں محروم رکھا اگر یہ شمارے آپ کے دفتر میں ہوں تو مجھے بھجوائیے۔ آپ کے پرچے کی فضا حرکت سے مملو ہے، اور دور جدید کے فکری مسائل پر آپ کے لکھنے والوں نے بڑی کام کی باتیں کہی ہیں، آپ کا اداریہ بھی اسی موڈ کا آئینہ دار ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں دو چار گستاخیاں کرنا چاہتا ہوں۔ اختر الایمان صاحب کا یہ جملہ پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ان کی نئی نسل سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نئی نسل تو اختر الایمان صاحب کو اپنا برادر اکبر سمجھتی ہے اور ان کے ساتھ محبت کرتی ہے۔ ان کا جگر تو اردو کے کھرداوں اور نگرد لوروں سے ہے جو ایوان ادب کی ڈیوڑھی میں کھانسی کا جھنڈ بجا رہے ہیں اور آنے جانے والے کا حلیہ نوٹ فرما رہے ہیں۔ اختر الایمان صاحب کو نئی نسل اپنے ہمراہ نظر آنی چاہئیے۔

آپ نے نئے ادیبوں پر سہل پسندی کا الزام لگایا ہے، آپ نے لکھا ہے یہ ادیب ریاضت اور مطالعہ سے جی چراتے ہیں اور فوری شہرت کے خواہشمند ہیں، میں اس معاملہ میں آپ سے سخت اختلاف رکھتا ہوں، معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، میں پرانی نسل کے بہت سے ایسے ادیبوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جنھوں نے ایک مقام پر پہنچنے کے بعد اپنی تحریریں کے علاوہ کچھ نہیں پڑھا، اپنی ہر بات کو انھوں نے حرف آخر سمجھا اور دوسروں کو بھی یہی کرنے پر مجبور کیا ہے، اس کے ساتھ ہی میں نئی نسل کے بہت سے ایسے ادیبوں کو بھی جانتا ہوں جنھوں نے مغربی اور مشرقی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور جن کی معلومات کا دائرہ پرانی نسل کے سکہ بند ادیبوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

بلراج کومل۔

آپ کے بھجوائے ہوئے دونوں پرچوں کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کے مقالوں کا معیار بلند ترین ہے، اس کے بعد افسانے اور سب سے آخر میں نظمیں آتی ہیں۔ اختر الایمان صاحب پر آپ کا مضمون تنقید کے بلند ترین معیار پر پورا اترتا ہے، نظمیں بہت کمزور ہیں اور ان کے معیار کو بلند کرنے کی مزید گنجائش ہے۔ شاید اس میں آپ کا قصور کم ہے اور شاعروں کا زیادہ جو ان کو بہترین سمجھ کر آپ کے پاس بھجوا رہے ہیں۔

علی جواد زیدی صاحب کا مضمون، محمد حسن صاحب کے مضمون کی نسبت حقیقت سے زیادہ قریب ہے، لیکن زیدی صاحب نے اس میں ذاتی واقعات داخل کر کے اس کی نفضا کو مجروح کر دیا ہے۔ آزاد ہندستان کی RESURGE-NCE کے بارے میں بہت سے لوگ ان کے خیالات سے اتفاق نہیں کریں گے، اس میں زیدی کی خوش فہمی اور جذباتیت کا زیادہ دخل نظر آتا ہے

آپ نے بجا فرمایا کہ نئی نسل کو نئی نسل کہنے کے لئے عمر کا معیار سامنے رکھنا درست نہیں، میں اس بات سے متفق ہوں، لیکن اس صورت میں اختر صاحب کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ اردو کے جملہ بقید حیات ادیب UPSTARTS ہیں، میرا خیال ہے اختر صاحب کا وہی مطلب ہے جو ان کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ شاید نئی نسل پیدا ہی نہ ہوئی ہو جو اختر صاحب کے معیار پر پوری اتر سکے۔ آپ کے خط کا دوسرا حصہ بہت فکر انگیز ہے، میں نے آپ کے اداریے کے الفاظ کو اپنی ذات کی نسبت سے نہیں لیا تھا۔ شاید کچھ دوسرے حضرات نے لیا ہو۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ جدید دور کی پیچیدگی کو سمجھنے کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ محنت اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ وہ ریاضت اور محنت تو کسی نہ کسی صورت میں ہو رہی ہے، لیکن اس کا فنکارانہ اظہار سامنے نہیں آیا، اس کا کارن ڈھونڈھنے کے لئے ہمیں اپنے ادبی سیاسی اور سماجی حالات کا تجزیہ کرنا ہوگا اور شاید ہمارے یہاں وہ لوگ ہی پیدا نہیں ہوئے جن کا ترگنیف نے ON THE EVE میں ذکر کیا ہے۔ جو لوگ CONFORMISM کا ذکر کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ تخلیقی تھکاندگی کا رونا رو رہے ہیں وہ یقیناً قابل معافی نہیں ہیں، آپ کو دور جدید کا اظہار فنکارانہ روپ میں کرنے کے لئے بہت بڑا جذباتی فکری اتھل پتھل کرنا پڑے گا اور شاید کچھ لوگ اس برِاعظم میں کسی گوشے میں پڑے یہ مشکل کام خاموشی سے کر رہے ہوں مجھے تو ان کی صورتیں جگنوؤں کی رات میں کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔ ان کے چہرے کے نقوش واضح نہیں ہیں، لیکن آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہم میں نہیں ہیں

سوغات بہت اچھا پرچہ ہے۔ آپ کی کوششیں قابل داد ہیں

براج کومل۔

فلپ راوُ

فرانز کافکا ایک تعارف

فرانز کافکا کی تخلیقات پڑھنے والوں کو حال ہی میں دستیاب ہوئیں لیکن اس عرصہ میں ہی اس کا نام جدید تخلیقی فنکاروں کی اس صف میں شامل ہوگیا جس میں جوائس، پروست، ریٹس، رلکے اور ایلیٹ جیسے لوگ موجود ہیں اور جنھیں بجا طور پر "مقدس اچھوت" کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں کافکا اس اعتبار سے مستثنیٰ رہا کہ اپنی زندگی میں اسے کوئی قابل ذکر شہرت اور مقبولیت نہیں مل سکی کیونکہ اس نے حین حیات اپنی طویل کہانیاں شائع نہیں کرائی تھیں اور جرمن ادیبوں کے ایک محدود حلقے سے باہر بمشکل کوئی اس کے نام سے واقف تھا۔ اس کی عظیم الشان عالمگیر شہرت اسے گزشتہ بیس برسوں میں ہی حاصل ہوئی ہے۔

انگریزی میں اس کی ایک کتاب کا ترجمہ پہلی بار اس کی موت کے کوئی چھے سال بعد ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا، اس کتاب کا نام تھا THE CASTLE. یہ ناول کافکا کی تخلیقات میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے، اس وقت بہت کم قارئین اس ناول کی اصلی روح کو پہچان سکے تھے۔ ۱۹۳۷ء تک بھی جبکہ کافکا کا دوسرا ناول THE TRIAL بھی منظر عام پر آچکا تھا، عام طور پر کافکا کی تحریریں اپنے بنیادی مقاصد اور اندرونی معنویت کی بجائے زیادہ تر اپنی پراسرار کیفیات کی وجہ سے لوگوں میں مقبول ہو رہی تھیں پڑھنے والے اس کی تحریروں سے متحیر ہوتے تھے، لیکن اس کی اہمیت کے قائل نہیں تھے لیکن آج کافکا کا مخصوص مگر طاقتور ادراک بیسویں صدی کے ادب کے خون میں شامل ہو چکا ہے کئی زبانوں میں اسے مختلف تنقیدی مطالعوں کا موضوع بنایا جا چکا ہے اور ہر جگہ حساس نوجوان لکھنے والوں نے جو مروجہ افسانوی تکنیک کی جامد حالتوں کا تصور رکھتے تھے اور تمثیلی اور اساطیری تصورات کے ذریعہ ایک تخلیقی احیا کرنا چاہتے تھے، کافکا کے طریقۂ کار کو سر آنکھوں پر لیا۔

آج مابعد الطبیعاتی طرز کے ایک ایسے ادیب کی حیثیت سے جس نے ہمیشہ انسانی وجود کے اساسی پہلوؤں سے تعلق رکھا، کافکا کے مقام اور مرتبہ کے بارے میں شک و شبہہ کا کوئی امکان نہیں رہا، اور نہ تخلیقی طریقۂ کار میں اس کے اجتہاد کی غیر معمولی انفرادیت سے آج انکار کیا جا سکتا ہے۔ اس نے DUINO ELEGIES میں رلکے کی

کے بجائے ادب کے نئے رجحانات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

وزیر آغا کا مضمون مختصر ہے لیکن اس میں بعض بڑے پتے کی باتیں ہیں، البتہ ان کی وضاحت، تجزیے اور مزید مثالوں کی ضرورت تھی۔ دوسرے یہ کہ نظم میں ادھر بعض چیزوں کو فروغ ہو رہا ہے جن پر تنقید کی ضرورت ہے، مثلاً طویل نظم، منظوم ڈرامہ یا مختصر ترین نظمیں، نئے امیجز بنانے کی کوشش، مجرد تصورات، محسوسات کے بجائے تخیلات کی بنیاد پر نظم نگاری وغیرہ۔ انھوں نے مضمون کے خاتمے میں مجید امجد کو جدید نظم میں سب سے اہم شخصیت قرار دیا ہے، مجید امجد یقیناً ہمارے اس وقت کے بہترین نظم نگاروں میں سے ہیں، لیکن ان کی نظم کا اسلوب یا ان کا طرزِ فکر خود ان تک محدود ہے نئی نسل میں وہ ابھی مؤثر قوت نہیں بن سکے ہیں، جس طرح اختر الایمان۔ اختر الایمان کی شاعری کے بہت سے عناصر کو نئی پود کے شعرا نے اپنے اپنے طور پر ابھارنے کی کوشش کی ہے اور اس کے پوشیدہ امکانات کو سامنے لائے ہیں، اس طور پر ضروری ہو جاتا ہے کہ اختر الایمان کی شاعری کے ان عناصر کو موجودہ دور کی روح کے پس منظر میں دیکھا جائے اور اس کا تجزیہ کیا جائے کہ اس کا اثر کیوں اس قدر عام ہے۔

"آگ کا دریا" پر تبصرہ تم نے بہت جی لگا کر کیا ہے۔ ابتک اس ناول پر جو تبصرے آئے ہیں وہ یک طرفہ ہیں یا ایسے لوگوں نے لکھے ہیں جو ناول خاص طور پر جدید ناول کے فن سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے، تم نے اس ناول کی رمزیت اور اس کے اساسی پہلوؤں کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے اس ناول کا دنیا کے ادب میں مرتبہ متعین کرنے کے بجائے اسے اردو ناول کے سرمایے میں ایک نئی روایت کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے اور تمھارے تبصرے نے اس بات کو واضح کر دیا ہے۔

اسپنڈر کے خط کے ترجمے نے بڑا مزہ دیا۔ کم و بیش یہی باتیں ہم لوگ ٹیبل ٹاک کے طور پر برسوں سے کر رہے تھے۔

خلیل الرحمن اعظمی

ہمارے درمیان گفتگو ہمیشہ کھل کر ہوئی ہے برا نہ مانیں تو یہ کہوں کہ "سوغات" کا پانچواں شمارہ معیار سے بہت گرا ہوا ہے۔ افسانوں کا حصہ بہت خراب ہے۔ پتہ نہیں آپ کیا الم غلم چھاپ دیتے ہیں اور کیوں اور وہ جو ایک افسانوی جائزہ شامل شمارہ ہے، اس کے کیا کہنے۔ آپ نے اداریے میں اس کا ذکر کیا ہے، مگر وہ تو چیتھڑے اڑانے کے لائق ہے۔ خدا کرے "سوغات" کا آئندہ شمارہ ویسا ہو جیسا کہ ۵ تھا۔

ضمیر الدین احمد

ابھی ایک شمارے کا ایک ایڈیٹوریل پڑھا، گھر کے پانچ پیاروں کو اکٹھا کیا اور سب کو سنایا، بڑے تجزیے

کی بڑی باتوں کی داد دیتے ہیں، اور چھوٹوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اردو رسالہ والا بے باک ہوتا ہے اور اپنے پلڑے سبھوں کو ترازو کے پلڑے میں ڈالتا ہے۔ سرکاری بتوں سے توڑتا ہے اور تب بھی اس کا رسالہ چھپتا رہتا ہے اور اس کی محفل میں وہ بھی شامل رہتا ہے جس کی اس نے تعریف کی اور وہ بھی جس کی نہیں کی ہم لوگوں کے لئے یہ بات عجب نہیں۔ لیکن ہمارے بچے اردو سے تقریباً محروم ہیں اور ہندی رسالوں اور ٹھیکیداروں نے ہماری ہندی کو جس عذاب میں ڈالا ہے اس کا ان بچوں کو بھی اتنا ہی احساس ہے جتنا مجھے۔ خیر۔ زیر نظر ایڈیٹوریل وہی تھا جس میں محمد حسن کے مضمون پر آپ کی مختصر سی تنقید تھی۔ ایک طرف ممتاز شیریں کا بڑا نام تھا اور دوسری طرف کسی چودھری صاحب کا۔ میں نے نہ ان کا افسانہ پڑھا ہے نہ ان کا لیکن اب دونوں کو پڑھنے کا اشتیاق ہے ویسے پڑھے بغیر خیال ہے آپ کے ساتھ اتفاق ہوگا۔ رام لال کے بارے میں آپ نے سولہ آنے صحیح رائے لکھی ہے یہ خط ایسا ہو رہا ہے جیسے میں شائع کرانے کی غرض سے لکھ رہا ہوں۔ ایسا ثواب میں نے آج تک کبھی نہیں کیا ہے، نہ آج کوئی ایسا ارادہ ہے

پریم ناتھ در

آپ نے میرے مضمون پر جو نوٹ دیا ہے اس کا طریقہ مجھے اچھا لگا اور بعض باتوں پر اس کی روشنی میں میں نے پھر سے غور کیا۔ انتظار حسین کا ذکر یقیناً اس نئے پہلو سے بھی ہو سکتا تھا

Good That Failed کے طریقے پر جن مضامین کا ذکر آپ نے کیا ہے اس کے بارے میں ابھی زمین ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔ میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ ہمارے یہاں تنقید نگاری کو جو فوراً بدنیتی پر محمول کر لیا جاتا ہے اور اپنے بارے میں ہلکی سی ہلکی تنقید بھی برداشت کرنے کی رواداری باقی نہیں رہی ہے اس سے لڑنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اسے اور اکسایا اور بھڑکایا جائے، بلکہ اصولی طور پر اس کی ترویج، اشاعت اور ترغیب کی ضرورت ہے۔ پہلے یہ کام ہو لے پھر تنقید کے لئے فضا ہموار ہوگی۔ اس وقت اس قسم کے مضامین کا وہی حشر ہوگا جو دوسرے مضامین کا ہوتا ہے، یعنی تخریب پگڑی اچھالنے کی تحریک شروع ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ ذاتیات پر ہوتا ہے۔ میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

آپ نے قرۃ العین حیدر کے ناول پر جو تبصرہ کیا ہے وہ متوازن ہے البتہ دو ایک باتیں رہ گئی ہیں، تبصرہ پسند آیا، اب تک جتنے تبصرے چھپے ہیں سب سے اچھا ہے۔

میری رائے میں آپ کو اس بار اداریے میں ایک موضوع پر ضرور اظہار خیال کرنا چاہئے وہ ہے آج ہندستان میں ادیب کے فرائض" اور یہاں ادیب کی محض ادیبانہ حیثیت کو پیش نظر رکھنا چاہئے اس کی شخصیت کو نہیں

یہ بات کہنی ہے کہ آج کے ہندستان سے ادیب کو متاثر ہونا چاہئے تو کس شکل میں؟ اگر اس کا کام سماجی ذمہ داری نہیں محض تفریحی ہے تو کس قسم کا تفریحی ادب وہ پیدا کر رہا ہے اور کس قسم کا تفریحی ادب پیدا کرنا چاہئے۔

محمد حسن

آج "سوغات" کا پانچواں شمارہ جون سے ہوتا ہوا یہاں آگیا۔ دیکھ کر خوشی ہوئی اس کی ترتیب بھی گزشتہ شماروں کی طرح ایک صاف ستھرے ذوق کا پتہ دیتی ہے۔ حصہ ہائے نظم و نثر دونوں ہی یکساں طور پر بھاری ہیں ان مضامین کی فراہمی کے لئے آپ کو کیا کیا ہفتخواں طے کرنے پڑتے ہوں گے آپ کی محنت اور لگن واقعتہً قابل داد ہے۔

تازہ شمارے میں مجنوں گورکھپوری نے شاد عظیم آبادی پر جو متوازن اور دو ٹوک تبصرہ کیا ہے وہ مکتوب کی حدبندیوں کے باوجود جامع ہے اور خاصے کی چیز ہے۔ تقسیم ہند کے بعد کی اردو نظموں پر وزیر آغا کا مختصر تبصرہ فکر انگیز ہے لیکن اس کی حیثیت چند واضح اشاروں سے زیادہ نہیں ہے دراصل یہ امر غور طلب ہے کہ تقسیم کے پہلے شعرا میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور وہ ان تبدیلیوں سے کس حد تک مختلف ہیں جو تقسیم کے بعد ابھرنے والے شعرا کے یہاں نظر آتی ہیں، میں ہمعصروں کے نام گناتے وقت ایک فطری جھجک محسوس کرتا ہوں کہ مبادا کسی جانب داری کا ملزم ٹھہروں، لیکن اگر وزیر آغا نے فیض، ندیم، یوسف ظفر اور قیوم نظر کا ذکر ضروری سمجھا جو تقسیم کے پہلے ابھر چکے تھے تو مخدوم محی الدین، مجروح سلطان پوری، آنند نرائن ملا، سردار جعفری، سلام مچھلی شہری، وامق جونپوری وغیرہ کے یہاں جو جدید رجحانات نظر آتے ہیں ان پر بھی اچٹتی نظر ڈالنا ضروری تھی، اگر بعد کے شعرا پر نظر کی گئی تو وحید اختر، فضا ابن فیضی، باقر مہدی، غلام ربانی تاباں، راہی معصوم رضا کو نظرانداز کر کے جائزہ کو جامع بنانا ممکن نہیں تھا اس خط میں وزیر آغا کے بنیادی خیالات سے بحث مقصود نہیں ہے۔ عرض یہی کرنا ہے کہ اگر اتنے قریب کے زمانے سے نتائج اخذ ہی کرنا ہیں تو تبصرہ کے دامن کو خاصا وسیع کر لینا ضروری ہے۔

اسپنڈر کے خط کا ترجمہ آپ نے شائع کر کے اچھا کیا، اس سے ہمارے اکثر نقادوں کو یہ محسوس ہو سکے گا کہ ایک طرف نئی نسل کے چند بے راہ رو ہیں جو زعم جدت و جوانی میں ہم عصروں تک کو اگلے وقتوں کے لوگ سمجھنے میں لذت محسوس کرتے ہیں تو دوسری طرف ان اگلے وقتوں کے لوگوں میں چند ایسے ہیں جن کے قلم میں جان اور تجربے میں توانائی ہنوز باقی ہے، سچ تو یہ ہے کہ ادب میں ادوار اتنی تیزی سے نہیں بدلتے جتنی تیزی سے نئی نسلیں ابھر آتی ہیں۔ یہاں اسپنڈر کے خیالات و معتقدات کا سوال اٹھانا بے کار ہو گا۔ لیکن جرأت و دلیری سے حق بات — یعنی وہ بات جو اپنے کو سچ معلوم ہو — کہہ جانا آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے مستند اہل قلم کا وطیرہ رہا ہے اور اس روایت کو باقی رکھنا ضروری ہے

محمد حسن کے جدید افسانوی ادب پر تبصرے کا جائزہ آپ نے خود ہی اداریہ میں لیا ہے۔ اس میں پریم ناتھ در کا تبصرے

ہی ذکر نہیں ہے، حالانکہ میرے خیال میں انھوں نے ادھر کچھ بہت اچھے افسانے لکھے ہیں

محمد حسن نے "مجھے بھی کچھ کہنا ہے" کے عنوان سے بھی کچھ لکھا ہے۔ آپ نے بحث ختم ہی کر دی اس لئے موضوع پر کچھ نہیں لکھوں گا، لیکن محمد حسن کے لہجے کی تلخی کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی، اسے تنگ مزاجی بھی تو نہیں کہا جا سکتا ادبی بحثوں کو اتنا ذاتی بنا لینا کہ قطع تعلقات تک کی نوبت آ جائے، کم از کم ان لوگوں کو زیب نہیں دیتا جو تنقید کی وادی میں قدم رکھتے ہیں اور دوسروں کی بھی دیانتداری اور بیدردی سے جرح قدح کرتے ہیں

اسی مضمون میں حقیر کی شان میں "کٹر اور میکانکی" "سطحی اور میکانکی بصیرت" وغیرہ کے خطابات عطا کرنے میں انھیں جھجک محسوس نہیں ہوئی لیکن میں نے ان کی شان میں صرف یہ لکھا کہ وہ ایک عظیم دارالعلوم کے لکچرار ہیں تو معلوم نہیں کیوں ان کے قلم کی زبان پر ایک رکیک ساجملہ تڑپ کر رہ گیا "؟ اگر ہمارے ناقدوں میں جو اکثر لکھتے رہتے ہیں اور بہت لکھتے رہتے ہیں، یہ ذہنی نارواداری آ رہی ہے تو ان چند سطروں کے ذریعے میں ان سے صرف یہی گزارش کروں گا کہ وہ اس خارزار کا رخ نہ کریں

علی جواد زیدی

سوغات کا شمارہ ۱۱، ہندستان سے نکلنے والے رسالوں میں شاید یہی ہے جسے ہم پاکستان کے ضخیم پرچوں کے مقابلے میں فخر سے پیش کر سکتے ہیں۔ معنوی اعتبار سے تو کئی خوبصورت چھپنے والے رسالوں سے آگے ہے، کم از کم اس پر کسی ذہنی تعصب کی چھاپ نہیں

زیر نظر شمارہ میں شہزاد منظر نے ابر کامو پر مقالہ لکھ کر محنت کا حق ادا کر دیا ہے، اگر ہر شمارے میں کسی نہ کسی اہم ادبی تحریک پر آپنے لکھوانے کا انتظام کر لیا تو یہ سوغات کی منفرد خصوصیت ہو جائے گی۔

محمد حسن اور وزیر آغا نئی پود کے دونوں نقادوں پر آپنے کافی بوجھ ڈال دیا ہے کہ افسانے اور نظم دونوں پر لکھیں وزیر آغا نے تقسیم کے بعد اردو نظم کا اچھا تجزیہ کیا ہے، مگر آخری پیراگراف جو اہم تھا جس میں روایت اور بغاوت کے توازن کی بات تھی وہی مختصر رہ گیا۔ محمد حسن نے اپنی بحث میں ایک اہم بات چھیڑی ہے جو یقیناً فوری توجہ کی مستحق ہے۔ آج پھر ایک بار ہماری شاعری تجرباتی دور سے گزر رہی ہے۔ کوئی قدر مشترک ایسی نہیں رہی جو معیار بن سکے ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں بھی ایسے سیکڑوں تجربے کئے گئے تھے۔

سڑک بن رہی ہے، ایک دو تین، چھن چھن چھن، اور ایسی ہی کتنی نظمیں اب بھی انتخابات میں محفوظ ہیں لیکن نئے لہجے کے اندر جب تک زندگی کا نیا تجربہ نہ ہو زیادہ دن نہیں چلے گا۔ سوغات ہی سے ایک مثال ملاحظہ فرمایئے، ایک نظم ہے "تم اتنا حسن کیا کرو گے" کوشش کے باوجود میں اس کے حسن تک نہیں پہنچ سکا۔

مختصر لفظوں میں میں سمجھتا ہوں کہ انکار کی بجائے اجتہاد کی راہ ادب کے لئے زیادہ صحت مند ہوتی ہے جہاں تک میں نے آپ کے تبصرے اور نظمیں پڑھی ہیں میں سمجھتا ہوں کہ آپ بھی مجھ سے متفق ہیں، آپ ہی کیا وہ تمام نئے شاعر جنھوں نے اپنا کچھ بھی مقام بنایا ہے، وہ اپنی تمام آزادروی اور تشکیک کے باوجود اردو کی حسین روایات اور بنیادی سچائیوں سے دور نہیں ہوئے ہیں

نظموں کے باب میں شعری کی نظمیں اچھی ہیں، خلیل نے شاید اچھے لکھے ہیں، مری نظم پڑھکر خوشی نہیں ہوتی میری کاہلی کی وجہ سے وہ مسودہ جو نظر ثانی کے بعد مکمل کیا تھا، آپ کو وقت پہ نہ پہنچ سکا، خیر یہ نہیں اور بھی ساقی فاروقی اور حبیب تنویر کی نظمیں واقعی قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے اسی سوغات کے پچھلے شمارے میں وحید اختر کی ایک نظم "کھنڈر اور آسیب" اور "پھول" شائع ہو چکی ہے۔ موجودہ نظموں کا موضوع بھی کم وبیش وہی ہے، تینوں نظمیں ایک ہی مزاج، ایک ہی ذہن کی عکاس ہیں، آج اوسط طبقہ کا نوجوان جس ذہنی کرب کے عالم سے گزر رہا ہے اسی کے فرسٹریشن نے ان نظموں میں ارتفاع پایا ہے، ایک طرف معاشی نظام میں کوئی توازن نہیں، دوسری طرف تعلیم نے محرومیوں کے احساس میں شدت پیدا کردی ہے

عقلیت پرستی نے رہے سہے روحانی سہارے بھی چھین لئے، ایک طرف خوابوں کی دنیا آج بے اثر ہے دوسری طرف انسان کی مادی ترقی نے ایک ایسی کروٹ لی ہے کہ خود انسان کے لئے خطرہ بن گئی ہے، ماضی کی اقدار مٹ رہی ہیں مستقبل کے لئے ایک اشتراکیت کا آسرا تھا وہ بھی دھندلا گیا۔ ایسے میں بعض حساس نوجوانوں میں ایک ایسی بیزاری نے جنم لیا ہے جو ایذا پسندی کی حد تک پہنچ چکی ہے، وحید اختر کی نظم میں یہ دنیا ایک مرگھٹ ہے، حبیب تنویر نے اسے قحط کے روپ میں دیکھا ہے، ساقی فاروقی نے اسے سحر زدہ شہر سمجھا، جس میں خوف اور اندیشہ کے آسیب منڈلا رہے ہیں، وحید اختر اور حبیب تنویر کی نظموں میں بالترتیب پھول اور مینا کے روپ میں امید زندہ ہے مگر ساقی فاروقی نے اسے بھی ختم کردیا اور نظم کی کلائمکس میں "ترک" کے مسلک پر پہنچ جاتے ہیں جو یقیناً اس احساس کا منطقی انجام ہے

فنی لحاظ سے وحید اختر اور حبیب تنویر کی نظمیں زیادہ کامیاب ہیں، انداز بیان میں بے ساختگی اور بے باکی کا احساس ہوتا ہے، اگرچہ یہ بے ساختگی "جھیل" والی نظم میں بعض جگہ نظم کی فضا سے ہم آہنگ نہیں ہو پائی، بعض بعض حصے ایسے بھی ہیں جو پیروڈی کے انداز تک پہنچ گئے ہیں مثلاً کبوتروں کا عندلیب کو آغوش میں سمیٹ لینا، ہرنوں کا نوک زباں سے چیتے کا منہ دھلانا، خصوصاً منہ دھلانا ضرورت سے زیادہ دلچسپ ہو گیا ہے۔ نظم آخر میں کچھ مبہم بھی ہو گئی ہے، مینا کو امید کا سمبل بنانا کچھ عجیب سا لگتا ہے

بقیہ صفحہ ۱۷۲

Smart Men Prefer
GD
GARMENTS
THE
GLOBE DRESS
MFG. CO.,
BANGALORE-2
جامہ زیبی کے حسن اور قیمت میں کفایت
کیلئے
گلوب ڈریس مینو فیکچرنگ کمپنی
کے تیار کردہ
جدید ترین ڈزائن کے ملبوسات
خریدئیے
اسٹاکسٹ: ہ۔ ایچ یل اسٹورز اولڈ پور ہاوز روڈ۔ بنگلور ۱
قیمتی ریڈیو
مرمت کیلئے اسی جگہ بھیجئے جہاں وہ محفوظ ہاتھوں میں رہے، وہ جگہ صرف
پیر الکٹرک سرویس ہے
ہمارا پچیس ۲۵ سالہ تجربہ آپ کے ریڈیو کی بہترین مرمت کی ضمانت ہے
پیر الکٹرک سرویس ۹۵ پولیس روڈ بنگلور ۲

hone : 71986. Regd. No. 3900/59.

THE QUARTERLY SOUGHAT

Editor : MAHMOOD AYAZ

27, CLINE ROAD, BANGALORE-5

WRAPPER PRINTED AT AZAD POWER PRESS, BANGALORE-1.